اِسلام
اور
عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شربت نزلہ
ھربل کف سیرپ
Sharbat Nazla
HERBAL COUGH SYRUP
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہترین تحفہ
دماغین
दिमागिन
dimageen
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

انگوری
ہربل ٹانک
अंगूरी
ANGOORI
HERBAL TONIC
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

خون صفا
خون صاف کرنے کی بہترین دوا
KHOON SAFA
BLOOD PURIFIER
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

اسلام
اور
عصرِ جدید

(سہ ماہی)

مدیر

اختر الواسع

معاون مدیر

فرحت اللہ خاں

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصر جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد : ۳۲ جولائی : ۲۰۰۰ء شمارہ : ۳

قیمت	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	۳۰ روپے	۱۰۰ روپے	(عام ڈاک سے)
	۵۰ روپے	۱۸۰ روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	۴۰ روپے	۱۵۰ روپے	(عام ڈاک سے)
	۵۵ روپے	۲۰۰ روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	۶ امریکی ڈالر	۲۰ امریکی ڈالر	(عام ڈاک سے)
	۱۲ امریکی ڈالر	۴۰ امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	۱۲۰۰ روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	۲۰۰۰ روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	۳۵۰ امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)

سرکولیشن انچارج
عطاء الرحمٰن صدیقی

طابع اور ناشر
ڈاکٹر صغرا مہدی

مطبوعہ
لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، دہلی

ادارے کا مصنفین کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

بانی مدیر : ڈاکٹر سیّد عابد حسین مرحوم

مجلس ادارت

جناب سیّد شاہد مہدی (صدر)

پروفیسر مشیر الحسن
جناب سید حامد
پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی
پروفیسر سلیمان صدیقی
پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر مجیب رضوی
خواجہ حسن ثانی نظامی
پروفیسر محمود الحق
پروفیسر شعیب اعظمی
پروفیسر رفاقت علی خاں

03145951212

ترتیب

۱۔ حرف آغاز	اختر الواسع	۵
۲۔ اسلامی ماحول میں عصری تعلیم	سید حامد	۹
۳۔ عہد عباسی میں ہندستانی در آمدات	شیث محمد اسماعیل اعظمی	۱۹
۴۔ فن خطاطی کی جمالیات	شکیل الرحمٰن	۲۵
۵۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی	صبیحہ سلطانہ خاں	۳۵
۶۔ حقوق نسواں اور اسلام (حسن ترابی کے افکار کا مطالعہ)	انجم آراء فلاحی	۵۱
۷۔ روس کے سیاسی افق پر اسلام کی واپسی	زلفی وقار ترجمہ: اخلاق احمد آہن	۶۹
۸۔ نفسیاتی علاج اور مسلم اطباء	عبد العلی ترجمہ: صلاں الدین محمد اسلم عمری	۸۱
۹۔ قرآنی ریاست	ہارون خاں شیر وانی ترجمہ: اختر الواسع	۹۵
۱۰۔ تبصرہ		
معماران جامعہ	محمد اسحاق	۱۲۷

اداریہ

حرف آغاز

گذشتہ صدی کے دوران سائنس و ٹکنالوجی کی ہوش ربا ترقیات کے زیر اثر دنیا جس تیز رفتاری سے تبدیل ہوئی ہے ویسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نقل و حمل اور مواصلات کے نئے ذرائع کے فروغ نے ’فراق و فصل‘ اور ’زمان و مکاں‘ کے فاصلوں کی بحث کو لاحاصل بنادیا ہے۔ زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور ساری دنیا ایک ’عالمی گاؤں‘ بن گئی ہے۔ اور یہ سب اس لئے ممکن نہیں ہوا کہ کرہ ارض کی جغرافیائی حدود گھٹ گئی ہیں بلکہ اس کا سبب وہ مواصلاتی اور اطلاعاتی انقلاب (Communication and Information Revolution) ہے جس نے رشتوں، رابطوں اور معلومات کے سلسلوں اور طریقوں کو ایک نیا رنگ روپ اور مفہوم دے دیا ہے۔

موجودہ صدی بلاشبہ اطلاعاتی انقلاب کی صدی ہے۔ آج ساری دنیا علم و معلومات کی اس راہ پر چل پڑی ہے جسے انفارمیشن سوپر ہائی وے یا اطلاعات کی شاہراہ عظیم کہا جارہا ہے۔ انٹرنیٹ کی صورت میں علوم و اطلاعات کا ایک عالم گیر خزانہ یا یوں کہیں کہ ایک نیا جام جہاں نما نوع انسانی کی دسترس میں آگیا ہے جس سے ذات برادری، عقیدے اور رنگ و نسل کی کسی بھی تفریق کے بغیر کوئی بھی مستفید ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک پوری علم مرکوز صنعت وجود میں آچکی ہے اور روز بہ روز مستحکم تر ہوتی جاری ہے جس سے روزگار کے نئے امکانات پیدا ہورہے ہیں۔ آج عام خواندگی کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر خواندگی بھی کامیابی کی لازمی شرط بن گئی ہے۔ کوئی بھی ملک یا قوم و ملت یا انسانی جماعت اس اطلاعاتی انقلاب کے ثمرات سے اجتناب یا بے اعتنائی برت کر یا اس سے محروم رہ کر خود اپنا ہی نقصان کرے گی کہ اس طرح وہ طاقت کے اصل سرچشمے سے دور جا پڑے گی۔

اطلاعاتی انقلاب تیزی سے زندگی کے ہر شعبے اور سرگرمی کو اپنی گرفت میں لیتا

چلا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں مذہبی امور، دینی علوم اور دینی درسگاہیں بھی اس کے عمل دخل سے گریزاں نہیں رہ سکتیں، اور نہ انہیں رہنا چاہیئے کہ نئی اطلاعاتی تکنالوجی دینی درس و تدریس، تبلیغ دین، دینی معلومات، افتاء اور مذہبی محفلوں کے عمل کو ایک بالکل نئی سمت و رفتار، رنگ و آہنگ اور معنویت دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس میدان میں اطلاعاتی تکنالوجی کے پوری طرح بروئے کار آنے کے بعد یہ صورت بھی پیدا ہو جائے گی کہ سیرت کے جلسے، وعظ کی محفلیں اور دینی درس و تدریس ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے ہونے لگے۔ چوں کہ آنے والے وقتوں میں لوگوں کے پاس کسی بڑے اجتماع کے لئے یکجا ہونے کے لئے وقت کم کم ہی ہوگا تو وہ اسی طریقے سے تمام دنیا میں ایک ہی وقت میں اپنے کسی پسندیدہ عالم، واعظ، خطیب یا استاد کے درس و ارشاد سے فائدہ اٹھائیں گے۔ انٹرنیٹ کو تبلیغ دین کا نہایت موثر ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ یہی معاملہ فتاویٰ کا ہے۔ انٹرنیٹ پر فتاویٰ کی ویب گاہوں (Web Sites) پر کسی بھی مسئلے میں مختلف علماء اور مفتیوں کے فتاویٰ سے روشنی حاصل کی جاسکے گی۔ تمام دینی علوم کا سرمایہ کتابوں سے اٹھا کر انٹرنیٹ کی معلومات گاہوں کے سپرد کیا جاسکتا ہے جہاں اسے اب سے کہیں زیادہ لوگوں کی رسائی میں لایا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں نے شروع شروع میں، مغربی تہذیب سے مغائرت اور اس سے متعلق شکوک و شبہات کے عام ماحول کے تحت، سائنس و تکنالوجی کی بعض ایجادات کو یکسر مسترد کیا۔ اس میں بقول اقبال طرز کہن پر اڑنے اور ہر طرز نو سے ڈرنے کا رویہ بھی کارفرما تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ علمائے دین کے ایک بڑے حلقے نے ایک زمانے میں اذان اور نماز کے لئے پبلک ایڈریس سسٹم کے استعمال کو مسترد کر دیا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے نئی تکنالوجی کے مظاہر ہماری روزمرہ زندگی اور معمول کا حصہ بنتے چلے گئے اور انہیں قبول کر لیا گیا۔

دینی درس گاہوں میں غالباً جامعہ ہدایت، جے پور پہلی درس گاہ ہے جسے کمپیوٹر کا استعمال شروع کرنے میں سبقت حاصل ہے۔ اب دھیرے دھیرے ہمارا مذہبی حلقہ اور دینی مدارس اس نئے سرچشمۂ علم و معلومات سے استفادے کی راہ پر تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں واقفیت ابھی عام نہیں ہے۔ ۲۷ و ۲۸ جون ۲۰۰۰ کو جامعہ ہمدرد میں مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور جامعہ ہمدرد، نئی دہلی اور ان کے علاوہ مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، سنٹرل وقف کونسل وغیرہ کے مشترکہ اہتمام کے تحت اور ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے تعاون سے، اطلاعاتی تکنالوجی انقلاب اور تعلیمی طور پر پس ماندہ اقلیتوں کے موضوع پر منعقد سیمنار اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ ہندستانی مسلمانوں کو علمی ترقی اور طاقت کے حصول کی راہ پر لے جانے کی سمت پہلی بامعنی پیش قدمی کہا جا سکتا ہے۔ اس سیمنار میں، اطلاعاتی تکنالوجی کو تعلیمی و اقتصادی طور پر پسماندہ اقلیتوں کی ذہنی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی بااختیار کاری کے لئے استعمال کرنے کی جن تدبیروں پر غور کیا گیا اور اس سلسلے میں مستقبل کا جو نقشہ مرتب کیا گیا اسے عملی تعبیر دینے کی سمت میں جو ادارے پہلے ہی سے نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں ان میں تحریک الامین، کونسل برائے فروغ اردو زبان، انجمن اسلام، ممبئی، اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونا اور دارالسلام ایجوکیشن ٹرسٹ، حیدرآباد بہت اہم ہیں اور ان مقاصد کے عمومی فروغ کے لئے مرکزی وقف کونسل اور مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن جیسے ادارے بھی خاصے سرگرم عمل ہیں۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، آنے والا وقت کسی عرصۂ محشر سے کم نہیں ہوگا۔ اس عرصۂ محشر میں ہر طرف سے یہی صدا آرہی ہوگی کہ "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے۔" اس زمینی محشر گاہ میں وہی لوگ باقی اور قائم رہ سکیں گے جو اپنی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بدرجۂ اتم بروئے کار لا سکیں گے اور اس طرح وقت کے نئے تقاضوں کا جواب بن سکیں گے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس پورے عمل کے دوران انہیں اپنی مذہبی، ثقافتی اور روحانی روایت کی زمین پر بھی قدم جمائے رکھنے ہوں گے اور اس روایت کی تعبیر نو کا فرض بھی ادا کرنا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ایک طویل مدتی منصوبے کا حصہ ہے جس کی تکمیل تبھی ممکن ہے جب ہمارے اجتماعی ملی وجود کے تمام اجزاء اپنی تمام تر صلاحیتوں کو یکجا کریں اور مستقبل سازی کے مشن کے تحت متحدہ طور پر ایک طے شدہ حکمت عملی کے ساتھ آگے بڑھیں۔

اختر الواسع

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

محکمۂ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110 006

اہل اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر

اردو انسائیکلوپیڈیا

(۳۲ علوم پر مشتمل تین کلیدی جلدیں)

طالب علموں، ادیبوں، صحافیوں اور علم دوست قارئین
کے لیے نایاب تحفہ

قیمت مکمل سیٹ: 1200 روپے

اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ ایک علمی دستاویز

جامع انگریزی اردو لغت

(حصہ اول تا ششم)

مرتبہ
کلیم الدین احمد

قیمت: مکمل سیٹ، 3400 روپے

ہندستان کے سب سے بڑے ادبی انعام "سرسوتی سمان"
سے سرفراز شمس الرحمٰن فاروقی کا شاہکار تنقیدی کارنامہ

شعر شور انگیز

(مکمل چار جلدیں)

تنقید شناسی میں دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں

قیمت: مکمل سیٹ، 600 روپے

غیر اردو داں حضرات کے لیے کونسل کا ایک انمول تحفہ
انگریزی کی مدد سے اردو سکھانے والی کتاب

انٹروڈکٹری اردو

(دو جلدوں میں)

سی. ایم. نعیم

قیمت: مکمل سیٹ، 116 روپے

اردو ادب کے عہد اولین کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ

تاریخ ادب اردو، ۱۷۰۰ تک

(پانچ جلدوں میں)

مرتبہ
سیدہ جعفر، گیان چند جین

قیمت: فی جلد 170 روپے، مکمل سیٹ: 850 روپے

بچوں کے لیے خوبصورت سوغات

چلڈرن بک ٹرسٹ کی کتابیں اردو میں

دلچسپ اور معلوماتی کہانیوں پر مشتمل

69 کتابوں کا اردو ترجمہ

قومی اردو کونسل شائع کر چکی ہے

سید حامد

اسلامی ماحول میں عصری تعلیم

تعلیم کے ضمن میں جو کچھ کہنے کے لائق تھا سب کو بار بار کہا جا چکا ہے۔ ایک دفعہ نہیں بار بار۔ ضروری ہے کہ ان میں سے چند موٹی موٹی باتوں کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔ سب سے پہلے ہمیں خواندگی مہم پر زور دینا چاہئے۔ امتیاز معکوس سے جتنی جلد ہمیں نجات ملے اتنا ہی اچھا ہے۔ ہم اپنے اپنے محلوں کو بانٹ کیوں نہیں لیتے کہ ان ان گھروں سے ناخواندگی اور نیم خواندگی ہم دور کریں گے؟ بچوں کے اہل حرفہ والدین کو قائل کریں گے کہ اپنے بچوں کو اسکول میں ضرور داخل کرو، کچے ہاتھوں اور معصوم محنت کی کمائی نہ کھاؤ، یہ گناہ کبیرہ ہے، ہم اپنی منفعت اور آسائش کے لئے بچوں کو دھندوں میں لگا دیتے ہیں، ان کی نشو ونما کو اپنی راحت پر قربان کرتے ہیں، دنیا جانتی ہے کہ شہروں میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت چھوٹی موٹی دکانداری کرتی ہے یا گھریلو یا نیم گھریلو دھندوں میں لگ جاتی ہے، یہ لوگ بچوں کو اسکول بھیجتے ہوئے الکساتے ہیں، داخل کرا بھی دیا تو اولین فرصت میں اٹھا لیتے ہیں کہ گھریلو دھندے میں باپ کا ہاتھ بٹائیں، اس رجحان کے خلاف اپنے اپنے محلے میں ایک مہم چلائیے، وہ مہم جو کبھی دم نہ لے، کبھی نہ رکے۔

شکرانہ ادا کرنے کی رسم فرسودہ ہو چلی لیکن ہے یہ برقرار رکھنے کے لائق۔ اگر پروردگار نے ہمیں علم، دولت، اقتدار، خوش حالی سے نوازا ہے تو اس کا شکر ادا کرنے کا صرف ایک طریقہ ہمارے پاس ہے، ان لوگوں کو جو علم سے محروم ہیں پڑھائیں، ان کو پڑھائی میں مدد دیں، علم اور روزگار کی بابت ان کی رہنمائی کریں اور کرتے رہیں۔

راقم السطور ملت کے بچوں کے لئے روزگار کی تلاش میں ایک عرصے سے سرگرداں

ہے، اس نے انہیں مقابلے کے امتحانوں کے لئے تیار کرایا ہے، لیکن نتیجہ محنت کے بقدر نہیں نکلا، وجہ ظاہر ہے، ہمارے بچوں کو گھر میں نہ تعلیمی ماحول ملتا ہے نہ تعلیمی امداد، لہٰذا وہ دوسرے فرقوں کے بچوں کا مقابلہ کر ہی نہیں پاتے، اپنی اپنی جگہ ہم خواہ کتنی ہی محنت کریں، مقابلہ کی رو کو کتنا ہی تیز کریں اس فاصلے کو ہم کم نہیں کر پاتے جو ہمارے اور ترقی یافتہ طبقوں کے افراد کے درمیاں ایک عرصے سے چلا آرہا ہے۔ ارتقاء کا دستور ہی یہ ہے کہ جو پیچھے رہ گیا وہ دوڑ میں اور پیچھے چلا جائے گا، اس لئے ضرورت ہے ایک انتہائی منظم، ملک گیر کوشش کی تاکہ ہم دوڑ کر ان کو پکڑ لیں جو ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ یہ منظم کوشش اوپر سے نہیں ہوگی۔ نیچے سے اوپر کی طرف جائے گی۔ ہم سب اپنی جگہ چھوٹی چھوٹی کوشش کریں گے تب کہیں انقلاب آفریں نتائج ہاتھ آئیں گے۔

بعض صاحبان آپ کو یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ مسلمان زوال کی آخری منزلیں طے کر رہے ہیں، اب کوشش کرنا بے سود ہے۔ یہ لوگ ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں، ان کی باتوں پر کان نہ دھریئے۔

غارت گر گل زار ہیں جو پھونک رہے ہیں
کانوں میں گل و لالہ کے مرجھانے کی باتیں

یہ دوہرانے کی ضرورت بھی شاید نہ ہو کہ علم کی رفیق آگہی ہے یعنی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، دنیا کن تغیرات سے دوچار ہے ان سے واقفیت بہم پہنچانا۔ ہمارے زیادہ تر بھائی واقعات اور افکار و حوادث سے ناآشنا ہیں۔ لاعلمی کے ماحول میں انسان نہ خواب دیکھ سکتا ہے، نہ تمنا کر سکتا ہے، نہ پسینہ بہا سکتا ہے اور نہ پرواز کے لئے پر تول سکتا ہے۔ وہ لوگ جو علم کے ذریعہ نت نئے تغیرات اور امکانات سے واقف ہو جاتے ہیں ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے کم آگاہ ہمسایوں کا ہاتھ پکڑیں اور انہیں تحصیل علم اور حصول روزگار کی راہیں دکھائیں۔ ان کو اس ہر آن زیادہ پیچیدہ بنتی ہوئی زندگی کی اونچ نیچ سمجھائیں۔ آپ کو یہ بات بہت انوکھی لگے گی لیکن ہے یہ سولہ آنے صحیح۔ ہندستانی مسلمان اس حالت سے جس کو وہ پہنچ گئے ہیں اگر نکلیں گے اور ترقی کریں گے تو صرف اس شکل میں کہ ان کے یہاں فرض ہمسائیگی بجالانے کی عادت جڑ پکڑ

جائے۔ ان کی نجات رہنماؤں کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے، ہمسایوں کے ہاتھوں میں ہے۔ فی الوقت ہندستانی مسلمانوں میں کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر ملک گیر قیادت کے قیام اور اس سے استفادہ یا اس کی پیروی کی صلاحیت ہے ہی نہیں۔ اس کے بہت سے رہنما (بالعموم) انا کے اسیر ہیں، ان کو اپنی فکر لگی رہتی ہے، وہ اپنا طواف کرتے ہیں، ملت کے مفاد سے جس کا ذکر ہر وقت ان کی زبان پر رہتا ہے ان کا دل ناآشنا ہوتا ہے، اسی لئے ان کا اثر قصبے یا شہر تک محدود رہتا ہے۔ راستہ اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص جو دل میں اپنے بھائیوں کا درد رکھتا ہو یا اس کا دعویٰ کرتا ہو اپنے ہمسایے میں اور اپنے حلقۂ اثر میں اپنی بساط کے مطابق اپنے بھائیوں کی باخبری اور رہنمائی کی ذمے داری اپنے شانوں پر لے لے۔ ان کے بچوں کی نشو و نما اور ان کی ہدایت میں برابر شریک ہو۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق ان مسائل پر تھوڑا بہت سوچا ہے اور موجودہ صورت حالات میں زوال کو پلٹ دینے اور عروج کی نیو رکھنے کا کوئی طریقہ اس کے سوا مجھے نظر نہیں آتا کہ جس کے پاس علم اور آگہی ہے وہ اسے اپنے بھائیوں میں بانٹے۔ وہ لوگ جو خوش حال ہیں وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ ایک بچے کو تعلیم دینے اور روزگار کے لائق بنانے پر صرف کریں۔ بقول مولانا محمد علی جوہر

"کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی"

اور اگر ہم اتنا بھی نہیں کرتے تو پھر مسلمانوں کی تباہی کا ماتم کیوں کرتے ہیں؟ ہر محلے میں ایک یا دو آدمیوں کو ڈھونڈھ نکالئے جو یہ کام کر سکتے ہوں، جو خون جگر دریغ نہ کرتے ہوں، اپنے محلے میں کسی مکان کے کمرے میں ایک چھوٹا سا دار المطالعہ یا ریڈنگ روم کھول دیجئے جہاں روزانہ تعلیم اور روزگار کے امکانات کو تختۂ سیاہ پر لکھ دیا جائے۔ یہ سارا کام جز وقتی ہے لیکن اس کے اثرات پائندہ ہوں گے، یاد رکھئے اسلام دین فطرت ہے، وہ فطرت کے قوانین کا احترام کرتا ہے، وہ یہ مانتا ہی نہیں کہ کوئی کام شعبدے یا جادو سے سرانجام پا جائے گا، وہ خدمت مانگتا ہے، محنت طلب کرتا ہے، اسے تنظیم سے لگاؤ ہے، لگن سے سروکار ہے۔

یہاں تک بات مقدار کی ہوئی تھی، مقدار سے کوئی مفر نہیں، اب ذکر معیار کا ہو جائے۔ ہم اپنے اسکولوں کو ٹھیک سے چلا نہیں پاتے، ان میں جا و بیجا مداخلت کرتے ہیں،

تقررات صلاحیت کی بنا پر نہیں کرتے، ایسی حالت میں معیار بہتر ہو تو کیوں کر ہو۔ ہم میں سے جو لوگ مناصب کو پہنچ گئے ہیں اور پہنچ کر سبک دوش ہوئے ہیں وہ خانہ نشین ہو جاتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ تعلیمی اداروں کو اپنی لیاقت اور تجربے کا فائدہ پہنچائیں، مقامی اسکولوں کے معیار کو اونچا کرنے کی ذمے داری کو پیش قدمی اور خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیں، یہ جانتے ہوئے کہ یہ راہ خار دار ہے، اس میں پاؤں لہو لہان ہو جائیں گے لیکن دنیا میں آج تک اس کے سوا چمن بندی اور گل کاری کا کوئی طریقہ وضع نہیں ہوا، آپ ویرانے کو گلستاں بنانا چاہتے ہیں تو میدان میں آجائیے، تھوڑی بہت قربانی کے لئے کمر کس لیجئے۔ آپ سے کون یہ کہتا ہے کہ دنیا کی آسائشوں کو یکسر ترک کردیجئے، آپ ایسا کریں گے بھی نہیں لہٰذا یہ کہنا بے کار ہے ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اپنے وقت اور اپنی کمائی کا ایک قلیل حصہ ملت کی تعمیر اور خدمت خلق پر صرف کردیجئے۔ ہم میں سے ہر ایک ایسا نہیں کرے گا تو جو خواب آپ دیکھیں گے چکنا چور ہو جائے گا، منصوبہ جو آپ بنائیں گے دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ یاد رکھئے اینٹوں کو جوڑ کر عمارت بنائی جاتی ہے، ان کے درمیان مسالہ بچھا کر ردے بٹھائے جاتے ہیں، بتائیے یہ مسالہ کیا ہے؟ یہ ایثار ہے، قربانی ہے، خون جگر ہے، یہ تھوڑا سا وقت ہے، تھوڑا سا پیسہ ہے جو ذاتی غرض سے اوپر اٹھ کر صرف کیا جائے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں کرسکتے؟ پھر مسلمانوں کے لئے فکر مند کیوں ہیں؟ اشک بار کیوں ہیں؟ شکوہ سنج کیوں ہیں؟ کوئی کام تو ایسا کیجئے جس سے ان کی حالت سنبھلے، وہ آگے بڑھیں، اتنا کچھ ہمارے بس کی بات ہے۔ حیرت ہے کہ ہم یہ کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ خود رسوائی مول لے رہے ہیں، قوم رسوا ہو رہی ہے، اپنے اوپر ترس کھا رہے ہیں لیکن خود کو اس لائق بنانے کے لئے کوئی جتن نہیں کرتے کہ ہم خود پر فخر اور دوسرے ہم پر رشک کریں۔ کیسی بے بسی، کیسی بے چارگی، کیسی بے حسی، کیسی بے عملی ہے یہ؟

دوسری کمی جس نے ہمارے پاؤں پکڑے ہوئے ہیں اتحاد کی کمی ہے۔ اسی طرح باہم رسہ کشی ہوتی رہی تو مسافت کیسے طے ہوگی، جہاں سے چلے تھے وہیں رہ جائیں گے، ایک قدم آگے نہ بڑھ پائیں گے۔ نجی اختلافات جو حسد، غیبت، ہوس اور غصے سے پیدا ہوتے ہیں کیا کم تھے کہ اجتماعی اختلافات نے سنگین شکل اختیار کرلی، انتہائی بھیانک مسلکی اختلافات کے بھنور

میں ملت پھنس گئی ہے، ہم جہاں جاتے ہیں ان شرمناک آویزشوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ وہ سازوسامان جسے ہم برآمد کرتے ہیں، اس پر بھی بس نہیں، اب چند سالوں سے اتنے ہی مہلک ایک اور اختلاف نے زور پکڑا ہے، یہ ہے نام نہاد اشراف اور برادریوں کا اختلاف۔ اختلاف اگر رائے کا اختلاف ہے تو فکر کی کوئی بات نہیں لیکن ہمارے پاس اختلاف کا ظرف بھی کہاں؟ یہاں اختلاف بہت جلد مخالفت میں بدل جاتا ہے اور مخالفت کو عداوت بنتے دیر نہیں لگتی۔ بے بنیاد عداوتوں نے ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کردیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان لوگوں کا احترام کم ہوتا تھا جو ہاتھوں سے روزی کماتے تھے، یہ کم احترامی، یہ قدر ناشناسی ہندستان تک محدود نہ تھی، دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھی گوکہ ہندستان میں اس کی شدت زیادہ تھی۔ وہ زمانے بیت گئے۔ جو لوگ دست دولت آفریں کے اور نفاق انگیز تاریخ کے منکر تھے اب اس پر بیعت کرنے کے لئے مستعد ہیں۔ لہٰذا پرانی یادوں سے کام و دہن کو اب تلخ کیوں کیا جائے؟ مسلمانوں کو اگر زندہ رہنا ہے، عزت کے ساتھ زندہ رہنا ہے، جہالت کو خیرباد کہنا ہے، ترقی کرنا ہے، تو مسلکی اور پیشہ ورانہ دونوں عداوتوں کو سدا کے لئے دفن کردینا ہوگا۔ یہ دونوں اسلامی اخوت اور مساوات اور انصاف اور اتحاد کی دشمن ہیں۔ ان دونوں خطرات کے ہوتے ہوئے ترقی کے خواب دیکھنا حقیقت سے آنکھیں بند کرلینا ہے۔ تہذیب اور شائستگی کا تقاضہ ہے اور پہچان بھی کہ ہم دوسروں کی رائے کا احترام کریں، مفاہمت کا ہاتھ بڑھائیں، آستین نہ چڑھائیں، یہودیوں اور عیسائیوں نے ان اختلافات کو جنہیں جڑ پکڑے ہوئے دوہزار سال ہوگئے، جن میں ہر آنے والی صدی اضافہ کرتی چلی گئی چشم زدن میں مٹادیا۔ آپ اطمینان کے ساتھ ان مسلکی اختلافات بلکہ مخالفتوں کو جن کی عمر بہ مشکل سو سال ہوگی ہوا دے رہے ہیں۔ انہیں دور کرنا کس قدر آسان ہے، آپ نے اسے کتنا مشکل بنادیا ہے۔ روم اور تل ابیب کے درمیان کی مسافت کتنی جلد طے کرلی گئی، ہم سے بریلی اور دیوبند کا فاصلہ طے نہیں ہو پارہا، اس کے لئے ہم نے نہ کوشش کی، نہ خواہش، نہ منصوبہ بنایا نہ قدم بڑھایا۔

اس اہم کانفرنس کا خاص موضوع، اس کی شاہ سرخی ہے "اسلامی ماحول میں عصری تعلیم"۔ دوسرے موضوعات ذیلی سرخیوں کے بطور تجویز کئے گئے ہیں۔ ایک ذیلی سرخی

ہے "عصری اداروں میں دینی تعلیم"۔ دوسرا عنوان ہے "مدارس میں عصری تعلیم"۔ گویا کانفرنس کے ارباب اہتمام اس فاصلے کو مٹانا چاہتے ہیں جو دینی اور عصری اداروں کے فارغین کے درمیان حائل ہے اور جس نے ملت کو دولخت کردیا ہے۔ ان کی پکار وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ ایک ایک کرکے ان دونوں موضوعات کو لے لیجئے۔ عصری اداروں میں دینی تعلیم کا اہتمام ان اداروں سے آگے نہیں جائے گا جو مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں۔ ان میں دینی تعلیم کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں اس اجلاس کے سامنے کیوں نہ یہ تجویز رکھی جائے کہ اس نصاب پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائیں جس میں دونوں طرز ہائے تعلیم کے ماہر شامل ہوں۔ شرعی اور فقہی مسائل بے شک پڑھایئے لیکن ایسی تعلیم بھی ضرور دی جائے جس کو حاصل کرنے کے بعد طالب علم اسلام کی امتیازی خصوصیات اور اس کی تاریخ اور انسانی تہذیب کی تشکیل میں جو حصہ اسلام نے لیا ہے، اس سے واقف ہو سکے۔ یہ نصاب تنازعات سے کترا کر نکل جائے۔ اس کمیٹی میں جو عصری اداروں کے لئے دینی نصاب کو مرتب کرنے پر مامور ہو ہر مسلک کی نمائندگی ہونی چاہئے۔ یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اس طرح ہم مسئلے کو صرف جزئی طور پر حل کر سکیں گے۔ کیوں کہ مسلمان طلبہ کی بڑی تعداد ان عصری تعلیم کے اداروں میں تحصیل علم کرتی ہے جو سرکار کی طرف سے چلائے جاتے ہیں یا غیر مسلموں کے زیر انتظام ہیں۔ ایک موٹے تخمینے کے مطابق، جو قیاس پر مبنی ہے، مسلمانوں کے زیر انتظام عصری اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد جملہ عصری اسکولوں میں ان کی کل تعداد کا تخمیناً ۱۰ سے ۲۰ فیصد تک ہوگی۔ ہم ان پچانوے یا نوے فی صد مسلمان طلباء کو جو عام اسکولوں میں عصری تعلیم پاتے ہیں دینی تعلیم سے محروم رکھنے پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کو دین سے بہرہ ور یا کم از کم روشناس کرنے کے لئے کیا تدبیر کیجئے گا؟ اس کے لئے بظاہر صرف دو راستے ہیں۔ پہلا اور سب سے اہم راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو گھروں میں دین کی بنیادی تعلیم اس طرح دیں کہ وہ ان کی رگ جاں میں پیوست ہو جائے۔ اگر استطاعت ہو تو گھر پر دینی تعلیم کے لئے بھی ایک نصاب مرتب کیا جائے یا ان کتابوں کی نشان دہی کر دی جائے جو بچوں میں دین کا شعور پیدا کر سکیں اور کتابوں کی آسان اور ارزاں دست یابی کا اہتمام کیا جائے۔ یہ کام

بظاہر چھوٹا سا ہے لیکن اس کا دائرہ تعمیل بہت بڑا ہے، سارے مسلمان گھرانوں کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔ جہاں والدین اس لائق نہیں ہیں، آپ آگے بڑھئے اور اپنے پڑوس کے بچوں کو دین کی تعلیم دینے کا اہتمام کیجئے۔ تعاون زر کا ہو سکتا ہے اور اوقات کا بھی۔

اب اور آگے بڑھئے اور تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالئے، یہ بات ہم سب کے لئے ہمت افزا ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند نے مدارس میں عصری تعلیم کی ضرورت پر غور کرنے کی بھی دعوت دی ہے۔ جس زاویے سے بھی دیکھئے یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، مدارس کے نصاب کے دینی عنصر کو تمام و کمال محفوظ رکھتے ہوئے ہمیں اس میں وہ مضامین ضرور شامل کرنا چاہئیں جو عصری آگہی فراہم کرتے ہیں، جو طلبہ کو ان حیرت انگیز اور عہد ساز تغیرات سے روشناس کرا سکتے ہیں جو علوم اور ٹکنالوجی کی برق رفتار پیش رفت کے جلو میں آئے ہیں اور جنہوں نے اس دنیا کی کایا ہی پلٹ دی ہے اور زندگی کے ساغر کو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے بھر دیا ہے۔ اگر مدارس کے طلبہ ان تغیرات سے ناواقف رہے تو دین کے بارے میں، جو ضابطۂ حیات ہے اور جو زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، ان کا علم ادھورا اور ناقص رہ جائے گا اور وہ دعوت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو ہی نہ پائیں گے، نہ وہ عوامی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لے کر اپنے غیر مسلم رفقائے کار اور ہمسایوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکیں گے۔ اس پر البتہ غور کیا جا سکتا ہے کہ عصری مضامین میں سے کن کن کو دینی مدارس کے نصاب میں شمولیت کے لئے ترجیح دی جائے۔ اچھا تو یہ ہو کہ ابتدا میں طلبہ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ عصری مضامین پڑھیں گے بھی یا نہیں اور پڑھیں گے تو ان کی ترجیحات کیا ہوں گی۔

عصری مضامین کے شمول سے بھی شاید زیادہ اہم، طریق تدریس میں تبدیلی ہے۔ آپ کو علم ہوگا کہ گزشتہ تقریباً دو سو سال میں طریق تدریس میں محیر العقول تبدیلیاں ہوئی ہیں، عالمی طریق تدریس میں یہ تغیرات دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف زمانوں میں عرق آور کاوشوں اور زہرہ گداز تحقیقات کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ صریح نادانی ہوگی اور خویش دشمنی اگر ہم طرز تدریس کی ان ترقیات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور دینی تعلیم کو تدریسی ارتقاء کی ضیابار منفعت بخشیوں سے محروم رہنے دیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ جامعہ

ہمدرد، جس کو متصورہ یونیورسٹی کی حیثیت سے یک گونہ آزادیٔ فکر و عمل اور پیش قدمی کی صلاحیت حاصل ہے، مدارس کے معلمین کو نئے طریق تدریس سے بہرہ ور کرنے پر غور کر رہی ہے۔ مدارس کا ردعمل مثبت ہے۔ امید ہے کہ آئندہ تعلیمی سال سے مذکورہ ٹریننگ کا اہتمام ضروری منظوریاں اور تعاون حاصل کرنے کے بعد کر دیا جائے گا۔ اس بات کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا کہ یہ کام جامعہ ہمدرد انجام دے یا جامعہ ملیہ اسلامیہ، جہاں اس کا بنیادی نظام پہلے سے موجود ہے۔ آپ کے لئے یہ اطلاع طمانیت کا باعث ہوگی کہ مسلمانوں کی تینوں عصری یونیورسٹیاں اپنے قدم ملا کر چل رہی ہیں، دعا کیجئے کہ یہ تعاون، یہ ارتباط ملی پیش رفت کے برگ و بار لائے۔

پایان داستان میں اجازت دیجئے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کے اجزائے عمل کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔

۱۔ اول۔ زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا۔

”پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے“۔ جنہیں خدا نے علم دیا ہے، شعور دیا ہے، تجربہ دیا ہے، بصیرت دی ہے انہیں یوم حساب سے ڈرنا چاہئیے۔ ان سے جواب طلب ہوگا کہ انہوں نے اپنے محروم بھائیوں تک روشنی کیوں نہیں پہنچائی؟ جہالت سے انہیں نجات کیوں نہیں دلائی؟ علم اور حکمت پر کنڈلی مار کر کیوں بیٹھ گئے؟ سوچئے کیا جواب دیجئے گا؟ آپ سے چھوٹا سا ایثار طلب کیا گیا اور آپ نے منھ پھیر لیا۔

۲۔ مسلمانوں کی وحدت کو نجی حرص وحسد نے اور اجتماعی اختلافات نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور آپ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے خاموش رہے۔ مسلکی اختلاف نے عداوت اور خونریزی کی شکل اختیار کر لی اور مسلمانوں کی تضحیک دنیا بھر میں ہوتی رہی اور آپ کے کانوں پر جوں نہ رینگی۔ برادری واد نے آپ کی وحدت کو مجروح کر دیا اور آپ نے کوئی قدم غلط فہمیوں اور عداوتوں کو دور کرنے کے لئے نہیں اٹھایا۔

۳۔ آپ کے بچے اسلام سے بے بہرہ اٹھتے رہے اور آپ کی نیند میں خلل نہیں پڑا۔ اب تو ان کا قصور صرف یہ رہ گیا ہے کہ ان کا نام اسلامی ہے۔ آپ نے انہیں گھر پر اسلام سے روشناس کرانے کا اہتمام کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ یہ کام کچھ دشوار نہ تھا۔ ہمسایوں سے

ہمدردی، ان کی رہنمائی، ان کی معاونت کا جو فرض آپ پر عائد ہوتا ہے اس کی طرف آپ نے سرے سے دھیان ہی نہیں دیا نہ آپ کے اسکولوں نے دینی تعلیم کا ایمان افزا اور دماغ کشا اور بصیرت افروز اہتمام ہی کیا۔

۴۔ دینی مدارس نے دنیا کے تغیرات پر اپنی تعلیم و تدریس کے دروازے بند کر دیئے اور کسی نے کروٹ نہیں لی۔

۵۔ کوئی اہتمام اس بات کا نہیں کیا گیا کہ عام مسلمانوں کو تعلیم اور روزگار کے بدلتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے امکانات سے بہرہ ور کیا جائے۔

ان ہی پانچ نکات کی طرف دھیان دیجئے۔ دھیان دینے سے مراد ان کے تئیں فکری آسودگی نہیں، بلکہ ان کو عمل میں لانا ہے، افق پر جہاں تک آپ کے ہاتھ اور آپ کی نگاہ پہنچے ہر طرف لکھ دیجئے عمل عمل عمل عمل عمل

تا کہ ہم سب کو ہر وقت یاد آتا رہے کہ قول افسانہ ہے، عمل حقیقت ہے، عمل ہی سے ساکھ بنتی ہے، شخصیت پروان چڑھتی ہے، وہ قول جس کو عمل سے سروکار نہ ہو سراسر فریب ہے۔

ایک چھٹے نکتے کا اضافہ کرنے دیجئے۔ جمعہ کی نماز کا نظم مسلمانوں کی تنظیم اور تعمیر کے لئے ایک بہت بڑا حربہ ہے۔ عربی خطبے کو محفوظ رکھتے ہوئے مقامی زبان میں ضرور خطبہ دیجئے اور تعلیمی اور فلاحی اور تعمیری اور اصلاحی مسائل پر ان خطبوں میں نمازیوں کو توجہ دلائیے، تعلیم اور صحت، ایثار اور اتحاد، تربیت اور تنظیم، رواداری اور باہمی احترام، صبر و ضبط کا سبق بار بار دہرائیے، دہراتے رہیے کہ اس کی ضرورت سدا رہے گی۔

مذکورہ تجاویز پر صاد کر کے اٹھئے اور اٹھتے ہی ان پر عمل کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیے۔

(یہ مقالہ اسلامی ماحول میں عصری تعلیم کانفرنس، انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی، ۲ر جولائی ۲۰۰۰ء میں پیش کیا گیا)

شیث محمد اسماعیل اعظمی

عہد عباسی میں ہندستانی درآمدات

ترقی یافتہ ممالک اور ثقافتی مراکز زمین کے ان نشیبی علاقوں کی طرح ہوتے ہیں جہاں بارش کا پانی تمام رکاوٹیں ختم کرتا ہوا آکر جمع ہو جاتا ہے، ان مراکز میں دور دراز کے ممالک کے افکار و خیالات، اوہام و عقائد، مظاہر فن، صنعت و حرفت اور صناع و دست کار خود اپنی حاجت روائی اور پھر قدر دانی کے لیے جمع ہو جاتے ہیں کہ تہذیبوں کی توسیع و اشاعت کا فطری طریقہ یہی ہے۔ آج ہم جن حالات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ دنیا بھر کے سائنس داں، دانشور اور خلاق ذہن مغربی ممالک کا رخ کر رہے ہیں یا دنیا بھر سے ضروریات زندگی کا سامان، سامان تعیش اور ماہرین فن خلیجی ممالک میں بار پا رہے ہیں تو یہ صورت حال ہمیشہ رہی ہے۔ دلی، غزنی، سمرقند و بخارا، رومۃ الکبریٰ اور بغداد سبھی اس تجربے سے گذر رہے ہیں، سبھوں کی حیثیت تجارتی اور تہذیبی مراکز کی رہی ہے، ان تمام نے تعصبات و تحفظات سے بلند ہو کر انسانی تمدن کے فروغ اور اس کی پیش رفت میں بیش از بیش حصہ لیا ہے۔

عہد عباسی کا عراق اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ عالمی گذرگاہوں پر واقع ایک منافع بخش اور قدر شناس منڈی تھا، یہ تجارتی شاہراہیں عراق کو مشرق سے بحری و بری راستوں سے جوڑتی تھیں، مشرق سے ہماری مراد یہاں ہندستان ہے کیوں کہ قرب وجوار کے دیگر مشرقی ممالک بھی اپنا سامان تجارت ہندستان کی بندرگاہوں یا منڈیوں کے ذریعہ ہی باہر بھیجتے تھے۔

چین و ہندستان کو عراق سے ملانے والا بحری راستہ ابلہ یا بصرہ سے شروع ہوتا تھا۔ سامان تجارت سے لدی بڑی بڑی کشتیاں خلیج عرب میں داخل ہوتے ہی خلیج کے مشرقی ساحل

کا رخ کر لیتیں، پھر جلد ہی ”سیراف“ کی بندرگاہ آجاتی جہاں سفر میں درکار پینے کا پانی لادا جاتا اور پھر اب ان بڑی کشتیوں کا رخ خلیج کے مغربی ساحل کی طرف ہو جاتا۔ کشتیاں عمان کے ساحل سے لگی لگی چلتیں اور صحارا اور مسقط جیسی عمان کی اہم بندرگاہوں پر ٹھہرتی ہوئی ہندستان کے لمبے سفر کے لیے تیار ہو جاتیں، ضرورت کے مطابق پانی کا ذخیرہ پھر سے جمع کیا جاتا۔ (۱) کشتیاں مسقط سے ’ثارا‘ کا رخ کر لیتیں۔ ثارا کی بندرگاہ ایران و سندھ کی سرحد تھی۔ اگلی منزل دیبل ہوتی، پھر جلد ہی اتکین نامی جگہ آجاتی، اب یہاں سے ہندستان کی سرحد شروع ہو جاتی۔ اتکین بانسوں کے جنگل کے لیے مشہور تھا۔ یہاں کے باشندے اپنی سرکشی اور رہزنی کے لیے جانے جاتے تھے۔ یہیں سے دو کوس کے فاصلے پر ”مید“ نامی قبیلے کی آبادیاں شروع ہو جاتیں، ”مید“ کاٹھیاواڑ اور خلیج کچھ میں سمندری قزاقی کے لیے بدنام تھے۔

ہندستان کے لیے خشکی کا راستہ بھی بصرہ ہی سے شروع ہوتا، پہلی منزل اہواز ہوتی پھر کرمان ہوتے ہوئے مکران پہنچتے جو سندھ کا ایک علاقہ تھا، سندھ کے بعد ہندستانی علاقہ شروع ہو جاتا۔ (۲) اگر تجارتی کشتیاں چین جا رہی ہوتیں تو دیبل کے بعد ان کا رخ خلیج بنگال کا ہو جاتا جہاں سے وہ سوماترا ہوتے ہوئے بحر چین میں داخل ہو جاتیں اور کینٹن پہنچ جاتیں۔

سمندری سفر کے لیے ان دنوں عرب ملاح اور دیگر لوگ، بحر روم، بحر احمر اور بحر ہند میں جو کشتیاں استعمال کرتے تھے وہ دو قسم کی ہوتی تھیں، ایک تو چھوٹی اور ہلکی کشتیاں تھیں جو ساحلوں کے ساتھ دوڑا کرتیں، دوسری وہ کشتیاں تھیں جو دور دراز کے سفر کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ ابن جبیر اندلسی کے بقول ان کشتیوں کے تختے ناریل کی بٹی ہوئی رسی سے جوڑے جاتے، جب کشتیاں تیار ہو جاتیں تو ان پر چربی ملی جاتی یا وہیل مچھلی کی چربی میں ان کو تر کر دیا جاتا۔ یہ سب سے اچھی کشتیاں ہوتیں۔ (۳)

بصرہ کی کشتیاں سفید رنگ کی ہوتی تھیں کیوں کہ ان پر چونا اور چربی ملی جاتی تھی۔ ہندستان کی کشتیاں بھی دو طرح کی تھیں، کچھ تو تیز رفتار اور ہلکی پھلکی سواریوں کے لیے مخصوص ہوتیں اور دوسری قسم کی کشتیاں بھاری بھر کم اور بڑی ہوتی تھیں جنہیں ’جنک‘ کہا جاتا تھا، ان بڑی کشتیوں پر سامان تجارت لادا جاتا تھا اور کبھی کبھی ان کو سواریوں کے ڈھونے

کے لیے بھی استعمال کرتے تھے (۴)۔ بغداد میں دور دراز کے ممالک سے درآمد کیے ہوئے ان سامانوں کی بڑی مانگ تھی، جو بغداد میں واقع درج ذیل مختلف بازاروں اور منڈیوں میں خرید و فروخت کے لیے لایا جاتا۔

ا۔ کرخ کے بازار: منصور کے بغداد کو پایہ تخت بنانے سے پہلے ہی بغداد ایک اہم تجارتی مرکز تھا جہاں مہینے میں ایک بار بازار لگا کرتا تھا جس میں ایران، اہواز اور دوسرے ممالک کے تاجر اپنی دکانیں لگاتے۔ یہ بازار دریائے دجلہ کے کنارے لگتا تھا۔ منصور نے ۷۶۲۔۷۶۶ء میں بغداد کی تعمیر کے وقت ان بازاروں کو شہر میں شامل کر لیا۔ ۷۷۵ء تک یہ بازار یہیں لگتے رہے، پھر ایک شاہی فرمان کے مطابق شہر سے باہر باب کرخ کے پاس لگنے لگے۔ اسی وقت سے کرخ کے بازار نے سب سے بڑی منڈی کی حیثیت اختیار کر لی، اس کی از سر نو ترتیب ہوئی اور الگ الگ سامانوں کے لیے سڑکیں مخصوص کر دی گئیں۔ ان سڑکوں پر دورویہ قطار اندر قطار دکانیں بنائی گئیں۔ ایک جگہ ایک ہی قسم کا سامان ملتا چنانچہ مختلف چیزوں کے خریدار اور تاجر خلط ملط نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی سامان تجارت گڈمڈ ہوتا تھا۔

دست کاروں اور کاریگروں کے بازار الگ تھے۔ یہ لوگ بھی اپنی اپنی مخصوص دکانوں میں رہتے تھے۔ ہر بازار اپنے سامان تجارت کی نسبت سے جانا جاتا تھا جیسے نخاس بازار (غلاموں کی خرید و فروخت کی منڈی) یا کاغذ بازار (کتابوں کی خرید و فروخت کا بازار)۔ بزازہ سب سے شاندار اور پر رونق بازار ہوتا تھا، پھر صابن والوں کا محلہ پھر عطر فروشوں کا محلہ، صرافہ، سرائے اور ہتھیار خانے اس کے بعد آتے تھے۔ محلہ حربیہ بدیسی تاجروں کا مرکز تھا۔ اس نام سے یہ بازار اس لئے مشہور ہوا کہ یہ منصور کے غلام فوجیوں کی چھاؤنی تھا (۵) اسی بازار سے لگا ہوا قید خانہ تھا جو باب الشام کے جیل کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کا بازار باب الشام کے بازار کے نام سے مشہور تھا۔ یہیں ایک میدان تھا جسے دار الرقیق (غلاموں کا گھر۔ غلاموں کا پورہ) کہا جاتا تھا۔ یہ محلہ شارع دار الرقیق کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ جعفر منصور کے لیے جو غلام لائے جاتے تھے وہ یہیں رکھے جاتے تھے۔ یہ غلام وسط ایشیا، روم، جنوبی یوروپ، ہندستان، مشرقی افریقہ اور حبشہ سے لائے جاتے تھے۔ (۶)

ان کے علاوہ دوسرے بازار بھی تھے۔ یہ بازار اس معاشی خوش حالی کے آئینہ دار تھے جو دوسرے ممالک میں عنقا تھی۔ جمعہ کو عراق کے بازار نہیں لگتے تھے۔ بغداد کے اہل بازار بغداد اور بیرون بغداد کی ثقافتی اور اقتصادی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے، خلیفہ کے محل میں کسی نو مولود کی آمد کے موقع پر جو جشن منایا جاتا اس موقع پر ان بازاروں میں بڑا جوش و خروش نظر آتا تھا۔ چنانچہ جب خلیفہ المقتدی کے یہاں سلطان کی بیٹی خاتون کے بطن سے نیا شہزادہ پیدا ہوا تو پورے بغداد کو سجایا گیا۔ صرافہ کو سونے چاندی کے برتنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا گیا، سڑکوں پر مجسمے سجائے گئے۔ جس طرح سرکاری جشن اور خوشی کے مواقع پر بازار سجائے جاتے تھے اسی طرح دکھ اور غم کے مواقع پر انہیں بند رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ کی موت پر سوگ منانے کے لیے بازار کی دکانیں بند رہتیں اور ان پر سیاہ ماتمی پردے لٹکا دئے جاتے جیسا کہ خلیفہ قائم بامر اللہ کی وفات پر ۱۰۷۳ء میں ہوا تھا جب بازار تین دن کے لیے بند رہے تھے اور دیواروں کو سیاہ کپڑوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔

جن ہندستانی بندرگاہوں سے یہ سامان عراق بھیجا جاتا تھا ان میں ’کولم ملی‘ سب سے اہم تجارتی بندرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ مغربی ہندستان کا ساحلی شہر تھا جو ایک طرف سے چین سے تجارت کا مرکز تھا تو دوسری طرف مغرب سے تجارت بھی اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ تجارتی کشتیوں پر جو چنگی لگائی جاتی تھی وہ اس شہر کے مالیے کا سب سے اہم ذریعہ تھی۔ مشہور اندلسی سیاح بنیامین التطیلی نے اس شہر کے لوگوں کے حسن معاملت اور ایمانداری کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق حکومت نے بڑے بڑے ذخیرے بنا رکھے تھے جہاں دیساور بھیجا جانے والا فروخت شدہ سامان تجارتی کشتیوں کے انتظار میں جمع رکھا رہتا تھا (۶)۔

’کولم ملی‘ کی بندرگاہ سے جو سامان بھیجا جاتا تھا اس میں عمدہ قسم کا ساگوان، بانس، جڑی بوٹیاں، دوائیں اور دھاتیں شامل تھیں، سیپ سے بنا ہوا سامان بھی بہت مقبول تھا۔ بغداد کے تاجر اس غلط فہمی میں رہتے تھے کہ یہ چینی صناعی کے نمونے ہیں (۷)۔

دوسرے سامانوں میں قیمتی پتھر، یاقوت، تمام قسم کی خوشبویات، عود، صندل سفید اور آبنوس شامل تھے، ہندستانی درآمدات میں ’عنبر‘ بھی خاص چیز تھی۔ لونگ، سیاہ مرچ، ناریل،

مخملی کپڑے، رنگین تہمد اور نیل بھی ہندستان ہی سے در آمد کیے جاتے تھے (۸)۔

یہ معاملہ یک طرف نہیں تھا۔ عرب تاجر اپنے ساتھ عراق، بحرین اور یمن سے عربی گھوڑے لے جاتے اور واپسی میں ہندستان سے دیودار کی لکڑی لاتے جن سے کشتیاں بنائی جاتیں اور مکانات کی تعمیر میں انہیں استعمال کیا جاتا۔ یہ لکڑیاں عراق کے چاروں طرف کے شہروں اور مصر تک بھیجی جاتی تھیں (۹)۔

چوتھی صدی ہجری میں عراق میں بھینس اور بیل بہت شوق سے پالے جاتے تھے۔ یہ مویشی ہندستان سے لائے گئے تھے (۱۰)۔ اسی زمانے میں عراق میں پہلی مرتبہ سنترے اور لیموں کے درخت لگائے گئے۔ اول اول یہ پودے ۳۰۰ ہجری میں عمان میں لائے گئے تھے، پھر بصرہ اور عراق کے اطراف میں ان کو کثرت سے اگایا جانے لگا۔ بصرہ کی نارنگیاں اور لیموں اپنے ذائقے کے لیے مشہور تھے (۱۱)۔

مرغیاں اور مور بھی ہندستان ہی سے منگائے جاتے۔ سندھی مرغی اپنے لذیذ گوشت کے لیے مشہور تھی۔ (بسٹرڈ نامی مشہور چڑیا آج بھی سندھی مرغی یا خس مرغی کہی جاتی ہے جس کا وزن ۱۰ کلو سے اوپر ہوتا ہے۔ یہ ریگستان میں عام ہوتی ہے۔ ابھی گذشتہ برسوں تک خلیج کے شیوخ اس کے شکار کے لیے راجستھان تک آتے تھے۔ اب یہ شکار ہندستان میں ممنوع ہو گیا ہے لیکن پاکستان کے سندھ علاقے میں خلیج کے شیوخ اب بھی اس کا شکار کھیلتے ہیں)

ہندستانی مور کے بارے میں مسعودی کا کہنا ہے کہ وہ بڑے خوبصورت ہوتے ہیں لیکن ہندستان سے لائے جانے کے بعد عراق میں ان کی نسل چھوٹی ہو جاتی ہے اور رنگ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ (۱۲)

ہندستانی ہاتھی بھی اہل بغداد کے لیے عجیب و غریب چیز تھے۔ مسعودی لکھتا ہے کہ منصور نے فرمائش کر کے ہندستان سے ہاتھی منگائے تھے (ہندستان سے بصرہ تک ہاتھیوں کے نقل و حمل کے لیے جو کشتیاں استعمال کی گئی ہوں گی ان کے طول و عرض کا اندازہ بھی کر لیجیے)۔ ان ہاتھیوں کو منصور جنگ میں بھی استعمال کرتا تھا اور اس کے علاوہ مختلف تہواروں اور تقریبات میں بھی ان کی نمائش ہوتی تھی (۱۳)۔

جاحظ نے سندھی جوتیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بصرہ و بغداد کے اشراف استعمال کرتے

تھے (۱۴)۔ اسی طرح ہندستانی صندل کے کنگھے بہت عام تھے اور پسند کیے جاتے تھے۔ مسعودی ایک لباس کا ذکر قراطق کے نام سے کرتا ہے۔ یہ 'کرتہ' کی بدلی ہوئی شکل ہے جو ہندستان سے درآمد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ملکہ زبیدہ نے کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی تعداد بڑھائی تو اس نے کنیزوں کے لیے پگڑیوں کا استعمال شروع کرایا۔ ان کے لیے بالوں کے نئے فیشن ایجاد کرائے اور انہیں ہندستانی کرتے پہنائے۔ (۱۵)

حوالہ جات

۱۔ حورانی، العرب والملاحة، ص۲۰۸

۲۔ دوری، تاریخ العراق الاقتصادی، ص۱۵۳

۳۔ ابن جبیر، رحلة ابن جبیر، ص۴۷

۴۔ ابن بطوطہ، رحلة، جلد۲، ص۱۱۶

۵۔ التطیلی، رحلة بنیامین

۶۔ التطیلی، رحلة بنیامین، ص۱۶۵

۷۔ القزوینی، آثار البلاد واخبار العباد، ص۱۰۷

۸۔ یاقوت، معجم البلدان، ص۲۰۹، ص۲۴۶

۹۔ الیعقوبی، کتاب البلدان، ص۳۶۹

۱۰۔ محمد جمال الدین سرور، تاریخ الحضارة الاسلامیة فی الشرق، دار الفکر العربی، ص۱۳۰

۱۱۔ المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم، ص۴۵

۱۲۔ المسعودی، مروج الذهب، جلد۱، ص۳۲۰

۱۳۔ المسعودی، مروج الذهب، جلد۱، ص۳۲۹

۱۴۔ الجاحظ، کتاب البخلاء، ص۸۷

۱۵۔ المسعودی، مروج الذهب، جلد۴، ص۳۲۶، ایضاً شوقی، العصر العباسی الثانی، ص۸۲

شکیل الرحمٰن

فن خطاطی کی جمالیات

عربی ایک بڑی تہذیب کی زبان رہی ہے، اس کے رسم خط کے حسن نے مذہب اور تہذیب دونوں کے جلوؤں کا شعور عطا کیا ہے۔ عرب، مراقش، مصر، ترکی، الجزائر، طرابلس، عراق، شام، ایران، حبش، سوڈان، اندلس، پامیر، قازان، لبنان، ہند، جاوا، ساترا، ملایا اور جانے کہاں کہاں اس زبان کے ذریعہ مذہب اور تہذیب کی سچائیاں پہنچی ہیں اور اس کی لچک اور آہنگ اور اس کے حروف کی جمالیاتی صورتوں نے احساسِ جمال کو متاثر کیا ہے۔

کوفی کے بعد خط نسخ نے دنیا کے حروف میں اپنی نمایاں جگہ حاصل کرلی، اس میں مسلمان فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑا دخل تھا۔ حروف کو خوبصورت بنانے اور تحریر کو منقش کرنے میں ہر دور کے فن کاروں نے بڑا حصہ لیا ہے۔ خطاطی کے اعلیٰ ترین نمونوں میں مصوروں کا تخلیقی ذہن ملتا ہے، عربی حروف کے حسن میں مصوروں کو مجرد پیکر کسمساتے ہوئے محسوس ہوئے ہیں، انہوں نے اس تحریر کو تزئین اور آرائش سے باضابطہ ایک فن بنادیا۔ مختلف اسلامی ملکوں میں مصوروں نے اس فن سے گہری دلچسپی لی اور چینی اور مانوی انداز تحریر سے بھی متاثر ہو کر خطاطی کے فن کو اعلیٰ ترین مقام پر لے گئے۔ غیر مسلم فن کار بھی اس سے متاثر ہوئے اور کلام کے معنی کی طرف توجہ دیئے بغیر عربی کی منقش تحریروں پر قرآن حکیم کی آیتیں لکھیں، اس تحریر کا حسن ہی تھا کہ جس نے غیر مسلم فن کاروں کو اس طرح متاثر کیا تھا۔

فن مصوری اور فن خطاطی کا رشتہ بہت ہی گہرا ہے۔ مصوری کی پیکر تراشی اور خصوصاً انسانوں اور جانوروں کی تصویروں کو پسند کیا گیا تو مسلمان فن کاروں نے مصوری کی بہتر خصوصیات کو فن خطاطی میں اجاگر کیا۔ مصوری میں بھی خطاطی کے فن کو شامل کیا گیا۔ اکثر

تصویروں کے گرد اور ان کے حاشیوں پر خطاطی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ مخطوطات اور مسودات کو مصور کرتے ہوئے، فنکاروں نے اکثر خطاطی کے آرٹ کی خوبصورت نمائش کی ہے۔ مسجدوں کے دروازوں، ستونوں، منبروں اور محرابوں کو اس فن سے اتنا پرکشش بنایا گیا ہے کہ یہ آرٹ کے یادگار نمونے بن گئے ہیں۔ خط کوفی کے “قلم الجلیل”، “قلم الدیباح”، “خط بیاض”، “قلم طومار” (طومار کامل الکبیر اور مختصر الطومار) “قلم الجلات”، “قلم الحرم”، “قلم رخشن”، “قلم القص”، “خط ریاش” اور “قلم لثلثین” وغیرہ نے حسن کا ایک معیار قائم کردیا تھا۔ ان کی روایات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

قلم کاروں اور خطاطوں نے ہلکے اور سبک، باریک اور موٹے اور چھوٹے اور بڑے واضح اور منقش حروف میں اپنی اعلیٰ فن کاری کا اظہار کیا۔ مسجدوں کے کتبوں، قدیم دستاویزوں اور معاہدوں، پرانی کتابوں کے سرورق اور ابتدائی مصحفوں اور بادشاہوں اور خواتین حرم کے خطوں اور قدیم قصوں کہانیوں اور مصوری کے نمونوں میں اس فن کی جمالیات کے عمدہ ترین نقوش ملتے ہیں۔

خط ثلث، خط نسخ، خط توقیع، خط رقاع، خط محقق، خط ریحان، نامۂ دبیریہ، رازِ سہریہ، شاہ دبیریہ، وغیرہ نے اس فن کی جمالیات کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ قرآن حکیم کے ان گنت نسخوں میں اس فن کے حسن کی جانے کتنی جہتیں پیدا ہوئی ہیں۔

قرآن حکیم کی نقل کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے، اس کی اپنی ایک بڑی تاریخ ہے جو خط کوفی کی ابتدائی صورتوں سے شروع ہوتی ہے۔ پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ ابتدائی دور میں شامل ہے جب کہ قرآن پاک کے نسخوں کی تیاری میں خط کوفی کا استعمال کیا گیا ہے۔ قاہرہ کے کتب خانے میں آٹھویں صدی عیسوی کا ایک نسخہ جو غالباً ۷۸۴ء میں تیار ہوا تھا موجود ہے۔ اس سے فن خطاطی کی ابتدائی صورتوں کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ نویں صدی عیسوی میں دور عباسیہ میں جانے کتنے نسخے تیار ہوئے جو اس فن کے عمدہ نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل خصوصیتیں اہمیت رکھتی ہیں:

- قرآن پاک کی اکثر نقلیں جھلیوں پر ہیں۔
- نیلے، بنفشی یا سرخ رنگوں کی زمین پر سیاہ یا سنہری روشنائی کا استعمال ہوا ہے۔
- کوفی حروف زیادہ موٹے اور واضح ہیں، جلی حروف کا اپنا ایک معیار ہے۔
- اکثر حروف دائرہ نما ہیں، حروف کو گول اور حلقوں کی صورتوں میں پیش کرنے کا رجحان ہے۔
- حروف ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں، اس لئے تحریر بہت حد تک گنجان ہے۔
- چھوٹے حروف عمودگی میں ہیں۔
- افقی انداز میں کسی حد تک مبالغے سے کام لیا گیا ہے، چپٹے حرف بھی توجہ طلب ہیں۔

نویں صدی میں خط کوفی، عراق، شام اور مصر میں مقبول رہا، دسویں صدی کی ابتدا میں بھی اس خط کے عمدہ نمونے ملتے ہیں، دور عباسیہ کی کئی نقلیں آج بھی موجود ہیں لیکن ان میں کوئی بھی قرآن حکیم کا مکمل نسخہ نہیں ہے۔

نویں صدی عیسوی کے نمونوں میں قرآن پاک کے وہ چار منقش صفحات اس وقت بھی اعلی فنکاری کا احساس دلاتے ہیں جو محفوظ ہیں اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ پتوں پر آب زر سے ابھرے ہوئے حروف سبز، نیلے اور بھورے رنگوں کو بھی لئے ہوئے ہیں، حاشیوں پر بھورے رنگ کا عمل ہے۔ مستطیل حروف کو درختوں کی صورت دے دی گئی ہے یا ان سے درختوں کا تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ ساسانی عہد کے آرٹ میں جس طرح پتوں یا پتیوں کو پروں کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا کم و بیش وہی انداز یہاں بھی ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی سے قرآن حکیم کے لئے خط نسخ کو زیادہ پسند کیا جانے لگا اور خط کوفی کا رواج کم ہونے لگا۔ بارہویں صدی کی ابتداء میں خط نسخ نے عروج حاصل کر لیا اور اس کی جمالیاتی جہتیں بڑی شدت سے ابھرنے لگیں۔ قرآن پاک کے بڑے نسخے “خط طومار” میں تیار ہونے لگے جو خط نسخ کی ایک انتہائی واضح صورت ہے۔ تیرہویں صدی کے خوبصورت نسخوں میں آب زر کا استعمال زیادہ ملتا ہے اور ساتھ ہی سرخ اور نیلے نشانات ملتے ہیں، نقطوں کو عموماً ان دو رنگوں میں پیش کیا گیا ہے۔ چودھویں صدی کی ابتداء میں یہ رجحان انتہائی پختہ ہو گیا

ہے، ساتھ ہی تزئین و آرائش کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ ایسے بھی نسخے ملتے ہیں جن میں عنوانات خط کوفی میں ہیں اور نقل خط نسخ میں ہے۔

شمالی افریقہ اور اسپین میں خط مغربی میں قرآن پاک کے متعدد نسخے ملتے ہیں، ان میں عربی حروف حلقوں کی مانند ہیں، گول حرفوں کی آرائش کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے نیز انہیں آب زر اور نیلے رنگ سے منور کرنے کی بھی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی کے بعض ایسے نسخوں میں کئی رنگ ملتے ہیں، یہ نسخے کئی رنگوں میں تیار کئے گئے ہیں۔

عجمی فنکاروں نے یہ آرٹ عربوں سے حاصل کیا تھا لیکن انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اس میں کئی اور عمدہ جمالیاتی جہتیں پیدا کر دیں، مزاج اور رجحان کے فرق کی وجہ سے بھی یہ فن ایران میں انفرادی خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس ملک میں تزئین و آرائش اور تصویروں کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور دلکش و دل نشیں بنانے کی روایت پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا فن خطاطی میں ایرانی مصوری کی کئی خصوصیتیں شامل ہو گئیں۔ ایرانی فنکار بلاشبہ عرب فنکاروں کے منقش اور منور نسخوں سے بے حد متاثر ہوئے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے مزاج اور رجحان کے پیش نظر نئے تجربے بھی کئے اور اپنی انفرادی صلاحیتوں سے کام لے کر اس فن کی اعلیٰ روایات کو نئے انداز سے آگے بڑھایا۔ نسخوں اور مسودوں کو منقش کرنے اور انہیں اپنے احساس جمال سے مزین کرنے میں ایرانی فنکار ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

عجمیوں نے دور عباسیہ کے خط کوفی میں جدتیں پیدا کیں اور رفتہ رفتہ خط کوفی کی ایک ایرانی صورت پیدا ہو گئی۔ تیرھویں صدی میں خط نستعلیق میں اس فن کے عمدہ نمونے پیش کئے گئے۔ حروف اوپر سے نیچے اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔ مقبروں اور مسجدوں پر خط نستعلیق کے ساتھ خط نسخ کو بھی شامل رکھا گیا۔ منگولوں کے عہد میں یہ فن عروج پر پہنچ گیا۔ قرآن پاک کے جانے کتنے خوبصورت نسخے تیار کئے گئے، عراق میں بھی اسی طرح منقش نسخے تیار ہوئے۔

فن خطاطی کے معروف فنکاروں میں قطبہ، خالد، خلیل بن احمد نحوی، علی بن حمزہ

کسائی، اسحٰق بن حماد شامی، ابراہیم الشمدی، یوسف، ریحانی، ابن مقلہ بیضاوی، ابوالحسن علی، (ابن بواب) مستعصم، حسن بن حسین علی، خواجہ میر علی تبریزی، مرتضیٰ قلی خاں، میر علی ہروی، محمد حسین تبریزی، میر عمادالحسینی قزوینی، عبدالرشید دیلمی، قطبۃ الحمد، خالق بن الہیاج، یاقوت مستعصمی، عبداللہ ابن محمد، سلطان علی مشہدی، جعفر تبریزی، عبدالکریم، ابراہیم سلطان ابن شاہ رخ، زین الدین محمود، میر علی ہیراتی، سلطان محمد نور، میر امداد، علی رضا عباس، اور مولانا حسن بغدادی وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ اس فن میں ان قلم کاروں اور فنکاروں نے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں، عمدہ اور نفیس روایتوں کی بنیاد رکھی ہے اور تزئین و آرائش کی جمالیات کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ ان کے فن کی چند امتیازی خصوصیات کو اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے:

☆ حروف کی پیمائش پر بڑی گہری نظر ہے۔

☆ طلاکاری کے فن کی نزاکت سے واقفیت غیر معمولی نوعیت کی ہے۔

☆ طلائی کتبوں میں آرائش کا رجحان متوازن ہے، طلاکاری اور رنگوں کی آمیزش میں توازن ہے۔

☆ جلی حروف جلال و جمال کے مظاہر ہیں۔

☆ طومار اور ثلثین کی آمیزش سے "قلم الزینور" کی تخلیق میں تخلیقی ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے۔

☆ ہلکے اور سبک قلم کی نزاکتیں احساس جمال کو متاثر کرتی ہیں۔

☆ خط ریحان میں حروف کی لوچ، جمالیاتی انبساط عطا کرتی ہے۔

☆ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قرآن کریم کی آیتوں اور لفظوں کے آہنگ سے فنکاروں کے اعصابی نظام کا پراسرار رشتہ قائم ہوگیا ہے اور ان کے خوبصورت حروف میں وہ آہنگ جذب ہوگیا ہے۔

☆ حروف کی تشکیل میں تخلیقی ذہن کا مسلسل عمل ملتا ہے۔

☆ بعض حروف پیکروں کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور اپنی تصویریت سے متاثر

کرتے ہیں۔

☆ سرخ، سبز، بنفشی، نیلے، سیاہ اور بھورے رنگوں کا استعمال فنکارانہ طور پر ہوا ہے۔

☆ گنجان تحریر کا بھی اپنا ایک حسن ہے، ذرا دور سے دیکھئے تو اس کا حسن اور متاثر کرے گا۔

☆ افقی اور عمودی حروف حسن کا ایک معیار پیش کرتے ہیں۔

☆ حروف کو دائروں میں پیش کرنے کا رجحان ملتا ہے، حلقوں اور دائروں کے اکثر سلسلے ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔

☆ حاشیوں کو مزین اور آراستہ کرنے کا رجحان شدت سے ابھرا ہے، آب زر اور رنگوں کے پس منظر میں جیسے حروف ابھرتے ہوئے سامنے آرہے ہوں، اس قسم کا تاثر پیدا کرنا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

☆ درختوں، پودوں اور پھولوں کا تاثر حروف، خصوصا مستطیل حروف سے پیدا کیا گیا ہے۔

☆ قرآن حکیم کے بعض نسخے ایسے ہیں جن کے ایک صفحے پر صرف دو آیتیں تحریر ہیں، دونوں آیتوں کے درمیان نقاشی اور تزئین کے لئے کافی جگہ رکھی گئی ہے۔ زمین کو حلقوں اور لکیروں کے حسن سے سجادیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آیتیں ان حلقوں اور لکیروں کے درمیان سے ابھرتی ہوئی چلی آرہی ہیں، تیرھویں اور چودھویں صدی کے بعض نسخوں میں اس فن کی یہ خصوصیت ملتی ہے۔

☆ سلجوقی آرٹ کی اکثر خصوصیتوں کو اس فن میں جذب کیا گیا ہے۔ آرائش وزیبائش اور تزئین کاری میں فنکاروں نے سلجوقی آرٹ کی خوبصورت روایتوں سے ذہنی رشتہ قائم کیا ہے۔

☆ فن تعمیر کی بعض اہم خصوصیتیں اس فن میں شامل ہو گئی ہیں، اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مقدس عمارت اٹھائی جارہی ہے۔ بارھویں صدی عیسوی کے بعض نسخوں میں، خصوصا مراقش کے نسخوں میں فن تعمیر کے جلوے ملتے ہیں، نقطوں اور اعراب کی وجہ سے یہ جلوے اور بھی پرکشش ہو گئے ہیں۔

☆ فنکاروں نے سیاہ نقطوں، 'لام الف' (لا، لا) ہمزہ، تشدید اور مختلف رنگوں سے حروف

کی آرائش میں بڑی مدد لی ہے اور جا بجا پھولوں کا تاثر پیدا کیا ہے۔

☆ ۱۰۵۰ء کے ایک عجمی نسخے میں (سلجوقی دور) 'سی مٹری' (Symmetry) کا غیر معمولی شعور ملتا ہے۔ تین سطروں کے بعد "محمد رسول اللہ" کو انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تزئین کاری غضب کی ہے۔ اس کے بعد نو سطریں جلی حروف میں ہیں اور تین سطریں باریک قلم کا نتیجہ ہیں۔ محمد رسول اللہ کو اس طرح نقش کیا گیا ہے کہ ایک ساتھ مسجدوں کی گنبدوں، روشن درختوں اور پھولوں، منقش ڈالیوں اور پرچم کے تاثرات ابھر آئے ہیں۔ سلجوقی آرٹ کی آرائش اور تزئین کاری کا یہ اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

☆ ایرانی فنکاروں نے بعض نسخوں کو اس طرح سجایا ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے گلستاں کے اندر حروف کا کوئی کارواں چل رہا ہے۔ ہر سطر میں ایک کارواں ہے، 'الف' اور 'لام' کی اٹھان سے عجب حسن پیدا ہو گیا ہے۔

☆ منظومات کے مجموعوں اور قدیم کتابوں، مسودوں اور مخطوطوں میں بھی اس فن کا حسن اپنے عروج پر ہے، یہاں فنکاروں کو زیادہ سے زیادہ آزادی ملی ہے، اس لئے چینی اور وسط ایشیائی خصوصیتوں کی روشنی بھی ملتی ہے۔

☆ پندرہویں صدی کے بعض مخطوطات پر حوروں، پریوں اور جانوروں کی تصویریں واضح ہیں اور حاشیوں پر نقاشی کے عمدہ نمونے ہیں، مخطوطات کے نام خط نسخ میں فنکارانہ انداز میں لکھے گئے ہیں، عربی تحریروں کے اندر بھی خطاطوں نے اپنی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔ نقش نگاری میں جو باریکی ہے اس کی اپنی لطافت ہے۔

☆ چمکتے ہوئے روشن حاشیوں کا دائرہ کبھی دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور درمیان میں اس فن کے ذریعے عمدہ ترین خطاطی کے نمونے ملتے ہیں۔

☆ روشن زمین پر، بڑے سائز میں ۹، ۱۰ اشعار لکھ کر جب بھی آرائش و زیبائش کے لئے چاروں طرف حاشیوں کو بڑھایا گیا ہے درمیان کی خوبصورت تحریر ہی بنیادی جلوہ بنی ہے۔ خوبصورت ترین رحل پر قرآن حکیم کے انتہائی منقش نسخے کے کھلنے کا تاثر دواوین اور منظومات کی خطاطی سے ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قیمتی سرمایہ محفوظ کر لیا گیا ہو۔

☆ کتابوں، مسودوں اور مخطوطوں کے سیکڑوں ایسے سرورق ہیں جو عراق، ایران، شام، چین اور وسط ایشیا کے مختلف خطوں کے حسن کی آمیزش کا عمدہ نمونہ ہیں اور ان پر خط نسخ کے نشیب و فراز اور حروف کے آہنگ اور توازن کا عجیب و غریب جادو نقش ہے۔

☆ خطاطی کے فن نے ہزاروں طغرے عطا کیے ہیں، طغروں میں آرائش و تزئین کاری اپنی جگہ پر ہے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی حروف کی تجریدیت ہے۔ اکثر طغرے تجریدی پیکر بن گئے ہیں۔ آب زر کا استعمال طغروں میں بھی ہے، سنہرے طغروں میں نیلے اور سیاہ رنگوں کے توازن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ دوسرے اور کئی رنگوں کا استعمال بھی ملتا ہے... روشنی اور سائے کے تئیں فنکاروں کی بیداری بھی توجہ طلب ہے، ترک فنکاروں نے اس سلسلے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ سلطان سلیمان کا طغرہ اپنی نظیر آپ ہے، عربی حروف کی لچک کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے جب خطاطوں کے تیار کیے ہوئے طغروں کی تصویریں سامنے ہوتی ہیں۔ درخت، پھول اور ڈالیاں، مینار، دیوار، منبر، ستون، محراب اور گنبد، چراغ اور اس کی روشنی، مور، اونٹ اور پرندے اور جانے کتنی اشیاء و عناصر کی مجرد صورتوں کا تاثر ملتا ہے۔ فن تعمیر کی اولین خصوصیتوں کا شعور بھی موجود ہے۔ اقلیدسی صورتوں کو جلوہ بنادیا گیا ہے۔ افقی اور عمودی صورتوں کا تاثر گہرا ہو گیا ہے۔ اسی طرح حروف دائروں اور مربعوں کی صورتیں بھی اختیار کر کے گہرا تاثر دیتے ہیں، مکعب صورتوں سے بھی خطاطوں نے گہری دلچسپی لی ہے اور طغروں میں حروف کو ان صورتوں میں اجاگر کیا ہے، حروف کی لچک سے ایک خاص قسم کے آہنگ کا احساس ملتا ہے۔

☆ خط نسخ میں کلی سے پھول بننے کی تمام تر صلاحیت موجود ہے۔ یہ خط کلی کی پنکھڑیوں کی مانند کھلتا ہے، پھول کی طرح روشن اور جاذب نظر بن جاتا ہے، اس میں ساکت ہو جانے، رکنے، رک کر چلنے، تیزی سے آگے بڑھنے اور پھیل جانے کی بڑی قوت ہے۔ خطاط عربی حروف کی ان خصوصیات سے واقف تھے لہٰذا ان کی مدد سے انہوں نے دوسرے فنون سے بھی رشتہ قائم کیا اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ خطاطی کے فن میں مصوری، موسیقی، فن تعمیر اور شاعری کی ان گنت خصوصیتیں ملتی ہیں۔

☆ لفظوں کو الگ الگ حسن کا نمونہ بنانے کی کاوش بھی غور طلب ہے۔ ساتھ ہی حروف کی کڑیاں پھولوں کے ہار کی طرح اپنے حسن سے متاثر کرتی ہیں۔

☆ نستعلیق کے اصول متعین کر کے اس فن کی جمالیات میں نئی جہتیں پیدا کی گئیں تو حرفوں، لفظوں اور جملوں کو جذب کرنے کا فن نقطۂ عروج پر پہنچایا گیا۔ اس جمالیاتی اصول کو ترکیب کہتے ہیں۔ اسی طرح 'سطح' صعود، نزول، ضعف وغیرہ جیسے اصولوں کو مرتب کیا گیا۔

☆ ہندستان میں مغلوں کے دور میں خط کی کئی جمالیاتی صورتیں پیدا ہوئیں جن میں خط بابری، خط ہلال (بدر کامل) خط ہائی، خط طغرا، خط غبار، اور خط گلزار وغیرہ کے نمونے یادگار بن گئے، فنکاروں نے اس فن میں مصوری کا حسن جذب کر دیا۔

فن خطاطی اپنی جمالیات کے ساتھ مسلمانوں کی بہت بڑی دین ہے!

صبیحہ سلطانہ خاں

شیخ عبدالقدوس گنگوہی

دسویں صدی ہجری کی وہ عظیم ہندستانی شخصیات جنہوں نے ملک میں چھائی ہوئی ظلمت و تاریکی پر نورِ عرفان کی شعاعیں ڈالیں، عوام و خواص کے دینی شعور کو بیدار کرنے میں بھرپور حصہ لیا اور گم کردہ راہ انسانیت کے لئے مشعل راہ بن کر انھیں ان میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۵ھ / ۱۵۳۸ء) کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

شیخ گنگوہی صابریہ سلسلہ کے پہلے بزرگ ہیں جن کے حالات معاصر تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں۔ آپ کو جو شہرت و عظمت حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے صابریہ سلسلہ کے کسی بزرگ کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے امام ابو حنیفہ پر منتہی ہوتا ہے (۱) آپ کے دادا شیخ صفی الدین (م ۸۶۰ھ) ردولی میں رہتے تھے۔ وہ حضرت میر سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مرید تھے۔ (۲) آپ کے والد کا نام شیخ اسماعیل تھا۔ بعض مورخین نے آپ کے والد کا نام شیخ صفی الدین بھی لکھا ہے۔ (۳)

آپ کی پیدائش ردولی میں ۸۶۱ھ میں ہوئی۔ وہیں آپ نے ملا فتح اللہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنی شروع کی لیکن درمیان میں ہی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور تصوف کی طرف مائل ہوگئے اور شیخ الصالح احمد بن داؤد العمری الردولی کے مقبرے میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ ذرا بڑے ہوئے تو حضرت شیخ احمد عبدالحق (۴) کے مزار پر جھاڑو دینا شروع کیا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ آپ ایک کتاب کافیہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھے، مزار کے اندر حق حق کی ایسی آواز سنی کہ آپ ازخود رفتہ ہوگئے، شیخ عبدالحق کی روحانیت سے فیض یاب ہوئے اور اسی روز سے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور علم باطنی اور شغل باطنی میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ (۵) تھوڑے ہی

عرصہ بعد تعلیم کی افادیت کا احساس ہوا اور آپ نے سوچا کہ جیسے کھانا بغیر نمک کے مزہ نہیں دیتا اسی طرح علم کے بغیر تصوف کا مزہ نہیں، چنانچہ دوبارہ تحقیق و مطالعہ میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنا کرم فرمایا اور علم و معرفت کے دروازے آپ پر کھول دیئے، آپ نے شیخ داؤد کے پوتے شیخ محمد ابن احمد الردولوی سے خرقۂ تصوف حاصل کیا۔ (۶)

شیخ گنگوہی حضرت شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبد الحق ردولوی (م ۸۵۵ھ) کے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے اور ان سے خرقۂ خلافت بھی پایا۔ آپ حضرت درویش قاسم اودھی کے بھی مرید اور خلیفہ ہیں لیکن اصل میں آپ حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی کی روحانیت سے مستفید و مستفیض تھے۔ آپ کو اویسی طریقہ پر حضرت شیخ عبد الحق ردولوی سے بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ جلد ہی آپ مدارج سلوک طے کر کے مرتبۂ تکمیل وارشاد کو پہنچے۔ ایک روز آپ کو شیخ احمد عبد الحق ردولوی نے یہ بشارت دی:

"تجھ کو میں نے ولایت بالادست عطا کی۔" (۷)

آپ نے اگرچہ شیخ محمد سے بیعت کی تھی لیکن حکمت و معرفت کے تمام اسرار حضرت مخدوم احمد عبد الحق کی صحبت سے حاصل کیے۔ آپ شیخ عبد الحق کے معتقد تھے اور ایک طرح سے انہیں کے مرید تھے، آپ کو شیخ عبد الحق سے اس درجہ عقیدت تھی کہ آپ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف انوار العیون کے پہلے فن میں شیخ احمد عبد الحق کے مناقب لکھے ہیں اور ان سے اپنی سچی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے جو کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ (۸)

شیخ عبد القدوس فرماتے تھے کہ "ویرانوں، مقبروں اور حجروں میں جہاں میرے سوا کوئی نہ ہوتا تھا تنہا مشغول بحق رہتا تھا۔ جب نماز اور تہجد کا وقت آتا قطب عالم شیخ احمد عبد الحق کی ولایت آ کر بیدار کر دیتی، حق حق حق کی آواز کانوں میں آنے لگتی، اس سے غفلت دور ہو جاتی اور میں ہوشیار ہو جاتا اور یہ معاملہ ہمیشہ پیش آتا۔" (۹)

دراصل آپ کو شیخ عبد الحق سے صرف روحانی تعلق اور آپ کے علم و کمال سے ہی عقیدت نہ تھی بلکہ حضرت مخدوم سے آپ کی رشتہ داری بھی تھی۔ حضرت مخدوم احمد عبد الحق کی پوتی آپ کی زوجیت میں تھیں۔ عمر خاں کاشی جو سلطان سکندر لودھی کے امراء میں

سے تھا آپ کا معتقد تھا۔ اس کی درخواست پر آپ مع اہل و عیال ردولی سے سکونت ترک کر کے شاہ آباد جو دہلی کے قرب وجوار میں واقع ہے تشریف لے گئے اور وہاں تیس سال سے زیادہ قیام فرمایا۔ شاہ آباد پٹھانوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں افغان کافی تعداد میں تھے۔ جب بابر نے ہندستان فتح کیا تو افغانوں کو منتشر کرنے کی غرض سے شاہ آباد کو بھی برباد کیا۔ آپ سے شاہ آباد کی بربادی نہ دیکھی گئی، آپ نے وہاں سے ترک سکونت کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ آپ مع متعلقین گنگوہ تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ (۱۰)

شیخ عبدالقدوس کے سات بیٹے تھے جن میں شیخ حمیدالدین، شیخ الکبیر اور شیخ رکن الدین مشہور عالم وزاہد تھے۔ آپ نے تیس جمادی الآخر ۹۴۴ھ کو انتقال فرمایا۔ بعض مورخین نے آپ کی وفات ۹۴۵ھ بتائی ہے۔ مزار شریف گنگوہ میں ہے۔ (۱۱)

حضرت شیخ صاحب کشف و کرامت تھے، سماع کا شوق تھا۔ مشہور ہے جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے عام طور پر وہی واقع ہوتا۔ سنت رسولؐ کے سختی سے پابند تھے سماع میں اکثر آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی اور آپ رقص کرنے لگتے اور والہانہ انداز میں کچھ فرمادیتے، ایک مرتبہ دہلی میں محفل سماع میں آپ شریک تھے آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور آپ حالت وجد میں کھڑے ہو کر یہ کلمات فرمانے لگے:

''منصور کو نادانوں نے قتل کیا۔''

کئی مرتبہ آپ نے یہی فرمایا، علماء بھی محفل میں شریک تھے ان میں سے ایک نے ایک بڑے عالم کا نام لیا جو منصور کے زمانے میں تھا اور آپ سے کہا کہ کیا وہ نادان تھا آپ نے اسی حالت میں اور اسی طرح فرمایا کہ اسی کو کہتا ہوں چنانچہ سب خاموش ہو گئے۔ (۱۲)

شیخ عبدالقدوس کی بعض تعلیمات حسب ذیل ہیں:

بھوک کی اقسام سے متعلق فرماتے ہیں: گرسنگی دو قسم کی ہے۔ علوی اور سفلی۔

بھوک کے فوائد میں فرماتے ہیں: ''گرسنگی کثیف کو لطیف تک پہنچاتی ہے اور مقید کو مطلق کا نشان دیتی ہے اور انسانیت کو رحمانیت کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ گرسنگی سے آدمی خدا تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔''

بھوک کے مقامات کے بارے میں فرماتے ہیں: "بھوک کے تین مقام ہیں، پہلے مقام کو بھوک کی آگ کہتے ہیں جس کی غذا پانی اور طعام ہے، دوسرے مقام کو درد محبت و عشق کی آگ کہتے ہیں اس کی غذا خون جگر اور خاشاک وغیرہ ہے، تیسرے مقام کو محبوب و معشوق کی آگ کہتے ہیں جس کی غذا حسن و جمال اور اوصاف کمال ہیں۔" (۱۳)

روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیخ عبدالقدوس موضع چھاج پور میں مقیم تھے۔ عین مشغولیت کی حالت میں شیخ نے یہ آوازہ بلند فرمایا کہ گاؤں کے لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا مال و اسباب لے کر گھروں سے باہر نکل آئیں گاؤں میں آگ لگنے والی ہے، تھوڑی دیر میں آگ لگی اور جن لوگوں نے آپ کی ہدایت کے موافق عمل نہیں کیا وہ پشیمان ہوئے اور انہیں نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اسی طرح شیخ کے کشف و کرامت سے متعلق ایک اور روایت ہے۔ مولانا چندن جو ان کے صاحبزادے شیخ رکن الدین کے استاد تھے اور شیخ عبدالقدوس سے بیعت تھے، ایک مرتبہ کپڑے دھونے تالاب پر گئے۔ وہاں ایک حسین عورت کو دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہوگئے، خلوت نے انہیں دست درازی کی ترغیب دی مگر قبل اس کے کہ وہ دست درازی کریں انہوں نے دیکھا کہ آپ تالاب میں عصا لئے کھڑے ہیں، مولانا چندن شیخ عبدالقدوس کو تالاب میں کھڑا دیکھ کر اپنے خیالات فاسدہ سے شرمندہ ہوئے، تالاب سے واپس ہوئے اور جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ عبدالقدوس نے مسکرا کر ان سے فرمایا:

"کچھ دہشت کی بات نہیں ہے پیر محافظ وقت ہوتے ہیں۔" (۱۴)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حالات زندگی کے بارے میں **لطائف قدوسی** میں مفصل بیان ہے۔ یہ کتاب شیخ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین نے تصنیف کی ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف ان کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے بلکہ حضرت شیخ کے ارشادات و کرامات کا بھی بیان ہے اور اس زمانہ کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ **لطائف قدوسی** کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اور آپ کے مرید مغلوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ حضرت شیخ کو لودھیوں سے خاص تعلق تھا، چونکہ سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء) نے اسلام کے اجراء کا خاص خیال کیا اس لئے اس کی دل سے قدر فرماتے تھے۔ (۱۵)

جن حالات میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو سلسلۂ صابریہ کی تبلیغ واشاعت کا کام کرنا پڑا وہ بڑے ہوش ربا تھے۔ ہندستان کی سیاسی فضا غیر یقینی تھی، مستحکم مرکزی نظام ختم ہو چکا تھا۔ سلطنت دہلی کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں، اس کا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ بے جان ہو چکا تھا، صوبوں میں خود مختار حکومتیں تھیں اور دارالسلطنت کے چاروں طرف ہنگامہ آرائی اور فتنہ فساد برپا تھا۔ ہندستان کی ان تمام سیاسی طاقتوں میں جو اس وقت اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے کوشاں تھیں راجپوت سب سے زیادہ منظم اور سیاسی بصیرت رکھنے والے تھے۔ پروفیسر شبورک ولیمس نے لکھا ہے کہ اگر بابر ہندستان نہ آتا تو راجپوت یقیناً اپنا اقتدار قائم کر لیتے۔ چندیری، ناگور، اجمیر، ردولی وغیرہ میں حالات ایسے نازک ہو گئے تھے کہ مسلمان ان علاقوں کو خیرباد کہہ کر دوسری جگہوں پر بسنے لگے تھے چنانچہ ان حالات میں سانس لینے والے بزرگ کا سیاست سے علٰیحدہ رہنا ممکن نہ تھا۔ سیاست اور سلاطین سے علٰیحدہ بھی اسی وقت رہا جا سکتا ہے جب کم از کم سماجی توازن درست ہو، سماجی انتشار کی صورت میں سیاست سے بچنا تقریباً ناممکن تھا۔ (۱۶)

شیخ عبدالقدوس اپنے ابتدائی زمانے میں اپنے شیوخ کے اصول کے مطابق سیاست اور حکمرانوں سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ اہل حکومت و سیاست سے گریز کی یہ حالت تھی کہ قاضی محمود تھانیسری جو اس وقت ردولی کے داروغہ تھا جب کبھی آپ سے ملاقات کے لئے آتا، حضرت شیخ اس کی آمد کی خبر سن کر فوراً ہی کسی ویرانے کی طرف چلے جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ان دنیاداروں سے مجھے ایسی ناگوار بو آتی ہے کہ میں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں، لیکن بعد میں حالات کے لحاظ سے شیخ کو اصلاح معاشرہ میں حصہ لینا پڑا اور شاہان وقت سے رابطہ قائم کر کے ان کو تلقین وہدایت کرتے ہوئے متعدد خطوط لکھے۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس نے اپنے ایک طویل خط میں سکندر لودھی کو مخلوق کی خدمت، ان کی غم خواری اور ائمہ وعلماء کی تعظیم و توقیر کی طرف توجہ دلائی اور لکھا کہ حالات کی درستی بہت کچھ ان کے ذریعہ ممکن ہے۔ (۱۷)

کچھ عرصہ بعد جب بابر کا تسلط ہو گیا تو انہوں نے مغل شہنشاہ کو بھی خط لکھا اور امر بالمعروف سے متعلق ہدایات دیں۔ اسے لکھا:

"تمہارے لئے مناسب ہے کہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سارے

> عالم پر انصاف کا سایہ اس طرح کرو کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے اور تمام مخلوق اور فوج، اوامر و نواہی اور شریعت پر مستقیم اور پابند ہو اور نماز باجماعت ادا کرے علم اور علماء کو دوست رکھو اور ہر شہر کے بازاروں میں محتسب مقرر کرو تاکہ وہ شرع محمدیؐ کے مطابق ان بازاروں کو آراستہ کریں جن شرائط کے ساتھ زمانہ سابق اور خلفائے راشدین کے عہد میں تھا۔" (۱۸)

قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے ۸۴ سال کی عمر پائی۔ انہوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ ان کی تصانیف میں سے اکثر افغانوں اور مغلوں کے ہنگاموں میں ضائع ہو گئیں، لطائف قدوسی میں جن تصانیف کا حوالہ ملتا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ بحر الانشعاب

یہ کتاب شیخ کے زمانۂ طالب علمی کی ہے جب کہ وہ علمِ صَرف کی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ اس زمانہ میں شیخ نے علمِ صرف میں ایک رسالہ بحر الانشعاب کے نام سے تصنیف فرمایا تھا جو آپ نے سوال وجواب کی صورت میں لکھا تھا جب اس فن کے اساتذہ نے اس نسخہ کو دیکھا تو اس کی فنی خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ علم صرف میں یہ نسخہ کافی ہے۔

۲۔ شرح مصباح

زمانۂ طالب علمی میں آپ کے اساتذہ درس کے وقت جو تقریریں فرماتے آپ انہیں اپنی شرح اور توضیح کے ساتھ اس رسالے میں جمع کرتے جاتے تھے۔

۳۔ شرح عوارف

اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے جس کا نمبر ۸۸۱ ہے۔ یہ بھی شیخ کی ابتدائی زمانہ کی تصنیف ہے۔

۴۔ رسالہ قدوسی

شیخ نے یہ رسالہ غالباً تصوف میں شیخ سلیمان مندوی (م ۹۴۴ء) کے لئے لکھا تھا اور انہیں باقاعدہ اس رسالہ کی تعلیم بھی دی تھی۔

۵۔ رشد نامہ

شیخ کے ابتدائی زمانہ کی تصنیف ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندی زبان میں مہارت رکھتے تھے، آپ کے مکاتیب میں بھی جو فارسی میں ہیں ہندی دوہے کثرت سے ملتے ہیں جنہیں آپ نے جابجا مضمون کی مناسبت سے نقل کیا ہے۔ رشد نامہ میں آپ نے مختلف دوہوں کے ذیل میں تصوف کے رموز و معارف کی تشریح فرمائی ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں آپ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین کا ایک نوٹ بھی ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ کتاب رشد نامہ میرے والد حضرت قطبی شیخ المشائخ شیخ عبد القدوس سرہ کی تصنیف ہے جو آپ نے ابتدائی زمانہ میں لکھی تھی۔

۶۔ نور المعانی شرح قصیدہ امانی

اس رسالہ کو آپ نے سکندر لودھی کے عہد حکومت میں لکھا اور اس کے دیباچے میں آپ نے وحدت الوجود پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔

۷۔ انوار العیون

اس کتاب میں حضرت شیخ نے شیخ احمد عبد الحق ردولوی کے حالات و مناقب مرتب کئے ہیں۔

۸۔ مظہر العجائب

اس کتاب کا تذکرہ خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں فرمایا ہے۔ لیکن یہ کتاب کس موضوع پر ہے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

۹۔ مجموعہ کلام فارسی

لطائف قدوسی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے اپنے فارسی کلام کا مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا۔

۱۰۔ رسالہ نور الہدیٰ

۱۱۔ رسالۂ قرۃ العین

۱۲۔ مکتوبات قدوسیہ

یہ مکاتیب کا وہ مجموعہ ہے جو آپ نے اپنے مریدوں، معتقدین اور خلفاء اور اپنے دور کے سلاطین اور ان کے امراء کے نام لکھے تھے۔

۱۳۔ اسرار العجائب

یہ شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جنہیں شیخ خضر بڈھن جونپوری عرف میاں خاں نے جمع کیا تھا۔

۱۴۔ اوراد شیخ عبدالقدوس

یہ شیخ کے ان اوراد و وظائف کا مجموعہ ہے جو آپ کے معمولات میں داخل تھے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے جس کا فن ادعیہ کے تحت ۱۲۷ نمبر ہے۔ (۱۹)

آپ شریعت کے اصولوں پر نہایت سختی سے عمل فرماتے تھے۔ تقویٰ و طہارت کا یہ عالم تھا کہ ان تمام چیزوں سے ہمیشہ پرہیز فرماتے تھے جن کی شرعی حیثیت ذرا بھی مشکوک معلوم ہوتی، اور اسی وجہ سے آپ ہر عام قصائی کے ذبح کئے ہوئے گوشت سے پرہیز فرماتے تھے کیونکہ ہر قصائی نمازی نہیں ہوتا۔ (۲۰)

تصوف میں مسئلہ وحدت الوجود ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ سب سے پہلے وحدت الوجود کے خیال کو فلسفہ کی صورت میں شیخ محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) نے پیش کیا۔ (۲۱) نقشبندیہ سلسلہ کے علاوہ ہندستان میں تصوف کے جو سلسلے رائج تھے وہ ایران و عراق سے یہاں آئے تھے۔ سلسلۂ قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ ان تینوں سلسلوں کے صوفیائے کرام پر وحدت الوجود کا اثر غالب تھا اور وہ ہمہ اوست کے قائل تھے۔ تذکرہ غوثیہ میں وحدت الوجود کی اس طرح تشریح کی گئی ہے:

> ”وجود یعنی ہستی حقیقی ایک ہے مگر ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن، باطن وجود ایک نور ہے جو عالم کے لئے ایک جان کی طرح ہے اسی نور باطن کا عکس ظاہر وجود ہے ہر اسم و صفت و فعل کہ اس ظاہر عالم میں ہے ان سب کا اصل وہی وصف باطن ہے اور اس کثرت کی حقیقت حقیقۃً وہی

> وحدت ہے جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ مختصر یہ کہ تمام افراد کائنات تجلیات حق ہیں۔ سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا، اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے الحق محسوس والحق معقول۔" (۲۲)

عارف رومی بھی وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ حیات و کائنات کی کثرت کو مجازی اور اعتباری اور وحدت مطلقہ کو حقیقی سمجھتے ہیں جو شخص کثرت کو حقیقی سمجھتا ہے، مولانا رومی اس کو بھینگے سے تعبیر کرتے ہیں کہ وہ اپنی آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے ایک ہی شے کو دو دیکھتا ہے حالانکہ حقیقتاً شے ایک ہی ہوتی ہے۔ چشتیہ سلسلے کے بعض اور بزرگوں کی طرح حضرت شیخ عبدالقدوس پر بھی وحدت الوجود کا رنگ شدت سے غالب تھا۔ انہوں نے دسویں صدی ہجری میں اس نظریہ کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور جب آپ وحدت الوجود کے قائل ہوئے تو آپ پر ایسا غلبہ ہوا کہ اسی کو ایمان کا جز سمجھنے لگے اور اس کے منکر کو بد عقیدہ سمجھتے۔ اسی ضمن میں لطائف قدوسی میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ایک بار آپ کے صاحبزادوں نے آپ سے دریافت کیا کہ وحدت الوجود کی کوئی تصریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں نہیں ملتی اور ہم اس کو اپنے عقیدہ کا جز بنائے بیٹھے ہیں کہیں آخرت میں اس پر مواخذہ نہ کیا جائے؟ حضرت عبدالقدوس گنگوہی نے پہلے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن پھر ان کے دل میں خیال آیا کہ میرے بیٹے وحدت الوجود کے منکر ہیں تو علم معرفت میں بھی ناقص ہیں اس لئے ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمایا اور اس بات کو اتنا زیادہ ناپسند کیا کہ گنگوہ چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ البتہ گنگوہ تو نہ چھوڑ سکے لیکن اپنے بیٹوں کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیا۔ (۲۳)

وحدت الوجود کا نظریہ علماء کے درمیان بڑا متنازعہ فیہ رہا ہے۔ علمائے شریعت کی اکثریت اسے اسلام کے مسلمہ حقائق سے انحراف تصور کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ شیخ ابن العربی کے نظریہ پر مشہور و معروف علماء علامہ رضی الدین ابن الخیاط، علامہ ذہبی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم وغیرہ نے سخت ترین تنقیدیں کی ہیں۔ اس نظریہ کے علمبرداروں نے مذہب کو ایسا رخ دیا ہے جس نے تمام مذاہب کا احاطہ کرلیا ہے اور تمام اعتقادات کو یوں متحد

کر دیا ہے جیسا کہ واحد حقیقت مطلق تمام اشیاء کو احاطہ کر کے انہیں متحد کر دیتی ہے۔ اس نظریے کا اظہار ابن العربی اپنے ان اشعار میں کرتے ہیں:

صحّ عند الناس انی عاشق
غیر ان لم یعرفوا عشقی لمن

"یہ بات کہ میں عشق میں مبتلا ہوں لوگوں پر ظاہر ہے، لیکن وہ اس ذات سے بے خبر ہیں جس سے (در حقیقت) مجھے عشق ہے۔"

اور پھر ان اشعار میں:

لقد صار قلبی قابلاً کل صورة
فمرعیٰ لغزلان ودیر لرھبان
وبیت لاوثان و کعبة طائف
والواح تورات و مصحف قرآن
فالحب بدین الحب انی توجھت
رکائبه فالحب دینی وایمانی

"میرا دل ہر ایک صورت کا مسکن بن گیا ہے۔ یہ غزالوں کے لئے ایک چراگاہ ہے اور راہبوں کے لئے خانقاہ اور بت پرستوں کے لئے مندر اور طواف کرنے والوں کے لئے کعبہ اور الواح تورات اور کتاب القرآن ہے۔ میں مذہب عشق کا پیرو ہوں اور اسی سمت چلتا ہوں جدھر وہ مجھے لے جائے کیوں کہ یہی میرا دین ہے اور یہی میرا ایمان۔" (۲۴)

شیخ گنگوہی کے علم سے فیض یاب ہونے والے کئی ایک مرید ایسے گذرے ہیں جنہوں نے کافی شہرت حاصل کی، ان میں سے ایک شیخ بھورو تھے (م ۹۸۲ھ)۔ یہ پہلے رنگ ریزی کا پیشہ کرتے تھے اور ہندو تھے لیکن آخر عمر میں آپ کی صحبت کی بدولت ایمان لے آئے اور اس درجہ کمال پر پہنچے کہ فقراء میں شمار ہونے لگا۔ یہ حضرت شیخ سے مرید ہونے سے قبل ہمیشہ شراب میں غرق رہتے تھے یہاں تک کہ ایک لمحہ بھی بغیر بادہ و ساغر کے نہ گذار سکتے تھے۔ اچانک رحمت الٰہی شامل حال ہوئی اور شراب ترک کر کے شیخ کی تلاش میں ایک طرف چل

پڑے۔ راستے میں ان کو ایک شخص ملا، اس نے کہا کہ تم مرشد کی تلاش میں کہاں جارہے ہو، تمہارے پیر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ تو شاہ آباد میں ہیں، شیخ بھورو نے یہ سنا تو فوراً شاہ آباد پہنچے اور شیخ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور عرض کیا کہ میں شراب کی عادت بد میں مبتلا ہوں۔ شیخ نے فرمایا کہ پریشان نہ ہو۔ تمہیں توبہ نصیب ہوگی۔ پھر شیخ نے ان پر دم کیا۔ اسی وقت سے ان کو شراب سے نفرت ہوگئی۔ اس کے بعد شیخ بھورہ نے شیخ سے حج کی اجازت طلب کی، فرمایا تمہارا مقصود یہیں حاصل ہوگا۔ پھر شیخ نے ان کی تربیت اپنے صاحبزادے شیخ رکن الدین کے سپرد فرمائی۔ شیخ بھورہ حضرت شیخ کے ارشاد کے مطابق شغل حق میں مصروف ہوئے یہاں تک کہ خلافت سے سرفراز کئے گئے۔ (۲۵)

دوسرے مرید شیخ عبدالغفور اعظم پوری حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے جلیل القدر خلفاء میں تھے، ان کا وطن اعظم پور تھا جو سنبھل کے اطراف میں واقع ہے۔ ابتدا میں انہوں نے کتب درسیہ کی تعلیم شیخ نظام الدین علوی کاکوروی سے پائی اور ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے اور پھر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اخبارالاخیار میں ہے کہ وہ نہایت بزرگ اور صاحب واقعات و کرامات تھے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ درود شریف تلقین فرمایا تھا۔

اللھم صلّ علیٰ محمد و آلہ بعدد اسمائک الحسنیٰ۔ (۲۶)

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شیخ عبدالغفور اعظم پور سنبھل کے رہنے والے تھے، وہ حضرت شیخ عبدالقدوس چشتی گنگوہی کے مرید اور بلند پایہ علماء میں سے تھے، ان کی باطنی اور ظاہری خوبیوں میں شک نہیں کیا جا سکتا، ان کا بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں گذرتا تھا، اتباع سنت کا یہ اثر تھا کہ وہ طالبان راہ سلوک کو خواہ انہیں کتنی ہی کم مناسبت کیوں نہ ہوتی منزل عرفان پر پہنچا دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ رشد و عرفان کے طالب علم دور دور سے ان کے پاس آتے تھے۔ علوم دینیہ کے درس و تدریس میں بھی ان کے وقت کا بڑا حصہ صرف ہوتا تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے اور کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔

وہ حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت میں بھی یکتا تھے۔ ۹۸۵ھ میں بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی اور اعظم پور میں تدفین ہوئی۔ (۲۷)

شیخ کے ایک اور مرید شیخ عبدالستار سہارنپوری سہارن پور میں پیدا ہوئے اور شیخ نصیرالدین سماء الدین (دہلی کے بڑے علماء میں شمار ہوتا ہے) دہلوی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر سلسلۂ چشتیہ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے بیعت ہو کر ایک طویل عرصہ تک ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول رہے اور شیخ نے ان کو خلافت سے سرفراز فرما کر قطبیت کی بشارت دی۔ ۹۵۰ھ میں وفات پائی۔ (۲۸)

شیخ جلال الدین تھانیسری بھی شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید و خلیفہ تھے اور اپنے وقت کے مشہور عالم اور کامل شیخ تھے۔ تمام زندگی عبادت و ریاضت اور درس و تدریس میں مشغول رہے، سماع سے خاص لگاؤ تھا، طویل عمر پائی، اور آخر عمر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہے۔ آپ کے پیر و مرشد شیخ عبدالقدوس نے آپ کو خطوط لکھے ہیں اور آپ نے بھی پیر و مرشد کے طرز پر خطوط تحریر کیے ہیں۔ ۹۸۹ھ میں وفات پائی۔ (۲۹)

شیخ عبدالاحد جو مجدد الف ثانی کے صاحبزادے تھے، مشائخ چشتیہ میں خاص شہرت و عظمت رکھتے تھے۔ وہ سرہند میں پیدا ہوئے اور تحصیل علم میں مصروف ہوئے۔ ابھی تعلیم نامکمل ہی تھی کہ قلب میں تزکیۂ نفس کا ذوق بیدار ہوا اور انہوں نے گنگوہ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی خواہش ظاہر کی۔ شیخ نے ان سے فرمایا کہ پہلے علوم شرعیہ و متعارفہ کی تکمیل کرو کہ بغیر علم کے درویشی کا لطف نہیں، شیخ عبدالاحد نے عرض کیا کہ تعمیل ارشاد میں مجھے کوئی عذر نہیں لیکن مجھے آپ کی کبر سنی کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ جب میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر لوٹوں تو آپ کی صحبت سے محروم رہوں، شیخ نے فرمایا اگر تم مجھے نہ پا سکو تو میرے فرزند شیخ رکن الدین موجود ہیں، تم جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو ان سے حاصل کرو اور تمہیں جس چیز کی تلاش ہے وہ تمہیں ان سے ملے گی۔ شیخ کے اس ارشاد کے بعد شیخ عبدالاحد سرہند لوٹ آئے اور علوم دینیہ کی تکمیل میں مصروف ہوئے یہاں تک کہ مختلف علوم میں غیر معمولی قابلیت پیدا کی، جب فارغ التحصیل

ہوئے تو شیخ عبدالقدوس وصال فرما چکے تھے۔ وہ مختلف مقامات کی سیر وسیاحت کرتے ہوئے اور وہاں کے شیوخ سے ملاقات اور فیوض حاصل کرتے ہوئے شیخ رکن الدین کی خدمت میں گنگوہ حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کر کے ایک طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے یہاں تک کہ شیخ رکن الدین نے ان کو ۹۷۹ھ میں اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا اور قادریہ اور چشتیہ سلسلے میں ان کو تلقین وتربیت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے بعد شیخ عبدالاحد اپنے وطن سرہند واپس ہوئے اور درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔ شیخ عبدالاحد یوں تو تمام فنون میں کامل مہارت رکھتے تھے لیکن فقہ اور اصول فقہ اور تصوف میں ان کا جواب نہ تھا۔ تصوف میں وہ ”تعرف“، ”عوارف“ اور ”فصوص“ کا درس دیتے اور ”اسرار توحید“ کو نہایت دلچسپ انداز میں واضح فرماتے تھے۔

شیخ عبدالاحد کی تصانیف میں کنوز الحقائق اور رسالہ فی اسرار التشہد وغیرہ مشہور ہیں۔ انہوں نے ۱۰۷۰ھ میں سرہند میں وفات پائی۔ (۳۰)

حواشی

۱۔ ڈاکٹر ظہورالحسن شارب، **خم خانۂ تصوف**، پریس آفسیٹ پرنٹرس، پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی، جنوری ۱۹۷۹، صفحہ ۲۵۴

۲۔ میر سید اشرف جہانگیر سمنانی (۷۷۰ھ/۸۷۱ھ) بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ سید علی ہمدانی کے ساتھ سیر وسیاحت میں ہم سفر رہے اور ہندستان آکر شیخ علاء الحق کے مرید ہوئے۔ بیعت لینے سے پہلے ہی آپ تصوف کے بلند مقام پر پہنچ چکے تھے۔ حقائق اور توحید کے بیان میں آپ کے اقوال بڑے پائے کے مانے جاتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، اخبار الاخیار، دارالاشاعت، بندر روڈ، کراچی، نقش اول ،جون ۱۹۶۳ء، صفحہ ۳۳۳

سیر الاقطاب (فارسی)، صفحہ ۲۹۴

شیخ احمد عبدالحق ۷۷۶ھ میں ردولی، ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ شیخ جلال پانی پتی

کے مرید اور صاحب تصرف و کرامات تھے، اکثر بے خودی کی کیفیت میں رہتے تھے۔ سات سال کی عمر سے تہجد کی پابندی کر لی تھی، بچپن سے ہی ظاہری علم سے زیادہ باطنی علم کی طرف متوجہ رہے اور اساتذہ سے صاف طور سے یہ کہہ دیا کہ "مجھے تو علم معرفت حق درکار ہے اور مجھے معرفت الٰہی سکھائیے کیونکہ یہی میری دلچسپی کا سبب ہے۔" اس پر تمام علماء حیران رہ گئے۔ ایک روایت کے مطابق شیخ احمد عبدالحق کہا کرتے تھے "منصور بچہ تھا ضبط نہ کر سکا اور اسرار الٰہی فاش کر بیٹھا بعض لوگ اب بھی ایسے ہیں جو سمندر پی جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔"

اخبار الاخیار، حوالہ بالا، صفحہ ۳۳۳

۵۔ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، خم خانۂ تصوف، حوالہ بالا، صفحہ ۲۵۵

۶۔ مولوی رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ مشہور آفسیٹ پریس، کراچی ۱۹۶۱، صفحہ ۳۱۸

۷۔ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، خم خانہ تصوف، حوالہ بالا، صفحہ ۲۵۶

۸۔ اخبار الاخیار، حوالہ بالا، صفحہ ۳۸۳

۹۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیاء، مطبع دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء

۱۰۔ انوار العارفین، صفحہ ۳۵۶

۱۱۔ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، خم خانہ تصوف، حوالہ بالا، صفحہ ۳۵۷

۱۲۔ نفس مصدر، صفحہ ۲۵۷

۱۳۔ نفس مصدر، صفحہ ۲۵۵

۱۴۔ نفس مصدر، صفحہ ۲۶۰

۱۵۔ شیخ محمد اکرام، رود کوثر، مطبوعہ تاج پرنٹرز، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، صفحہ ۳۷

۱۶۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، مطبوعہ جید پریس، بلیماران، دہلی، ۱۹۸۰ء، صفحہ ۲۱۸

۱۷۔ اعجاز الحق، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات،

ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۱۸

۱۸۔ نفس مصدر، صفحہ ۲۳۲

۱۹۔ نفس مصدر، صفحہ ۴۲۱

۲۰۔ نفس مصدر، صفحہ ۳۷۰

۲۱۔ شیخ محی الدین ابن عربی نظریۂ وحدت الوجود کے بانی قرار دیئے جاتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ مختصر طور سے ان چند الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس نے سب اشیاء کو پیدا کیا اور جو خود ان کا جوہر اصلی (اعیانہا) ہے۔“ نیز اس شعر میں بھی:

یا خالق الاشیاء فی نفسه انت لما تخلقه جامع
تخلق مالاینتہی کونه فیک فانت الضیق الواسع

”اے کہ تو نے تمام اشیاء کو اپنی ذات میں خلق کیا، تو جمع کرتا ہے ہر اس چیز کو جسے تو پیدا کرتا ہے، تو وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کا وجود تیری ذات میں (مل کر) کبھی فنا نہیں ہوتا، اور اسی طرح تو ہی تنگ ہے اور تو ہی وسیع بھی ہے۔“

تفصیل کے لئے دیکھئے، ابوالعلاء عفیفی، دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) دانش گاہ پنجاب، لاہور، جلد اول، صفحہ ۶۰۹ تا ۶۱۰

۲۲۔ اعجاز الحق، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات، حوالہ بالا، صفحہ ۲۳۵

۲۳۔ ڈاکٹر شبیر احمد، عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں، مطبع نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۲، صفحہ ۷۴

۲۴۔ ابوالعلاء عفیفی، دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) حوالہ بالا، جلد اول، صفحہ ۶۱۱

۲۵۔ اخبار الاخیار، حوالہ بالا، صفحہ ۲۲۱

۲۶۔ سید عبدالحی بن فخرالدین الحسنی لکھنوی، نزهة الخواطر و بهجة المسامع و النواظر، مطبوعہ دائرۃ معارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۹۵، جلد

ہفتم، صفحہ ۱۴۴

۲۷۔ ملا عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد سوم، صفحہ ۴۲

نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، حوالہ بالا، جلد
۲۸۔ چہارم، صفحہ ۱۷۷

۲۹۔ اخبار الاخیار، صفحہ ۴۷۶

۳۰۔ نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، حوالہ بالا، جلد
پنجم، صفحہ ۱۹۳

انجم آراء فلاحی

حقوق نسواں اور اسلام

(حسن ترابی کے افکار کا مطالعہ)

یہ مقالہ تحریک اسلامی کے مشہور سوڈانی قائد ڈاکٹر حسن ترابی کے افکار و نظریات کے تجزیہ پر مشتمل ہے جنھوں نے تحریک اسلامی کو خواتین میں عمومی مقبولیت دلانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر حسن ترابی (۱۹۳۲ء) سوڈان کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم اپنے والد بزرگ سے حاصل کی۔ جدید تعلیم کی تکمیل کے لیے خرطوم، لندن اور سار بون وغیرہ کا سفر کیا اور اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تحریک الاخوان المسلمون سے آپ کا تعلق ۱۹۵۰ء میں طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ اور اکتوبر ۱۹۶۴ء کے عوامی انقلاب میں ایک ہر دل عزیز لیڈر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ اسلامک چارٹر فرنٹ کے نام سے ایک محاذ قائم کیا تاکہ اس کے ذریعے ملک میں اسلامی آئین سازی کی جدوجہد تیز کرسکیں۔

۱۹۶۹ء میں ملک میں جو فوجی انقلاب برپا ہوا اس سے ڈاکٹر ترابی کی جمہوری اسلامی کوششوں کو دھکا لگا۔ انہیں ملک بدر ہونا پڑا مگر ۱۹۷۷ء میں صدر مملکت جعفر نمیری نے ڈاکٹر ترابی اور ان کے بہنوئی صادق المہدی سے مصالحت کرلی۔ اس سیاسی مصالحت کے نتیجے میں وہ ملک کے اٹارنی جنرل مقرر ہوئے اور اخوانی کارکنوں کو عوامی زندگی کے مختلف دائروں میں نو تشکیل شدہ اسلامی بینکوں اور مسلح افواج میں شریک ہونے پر ابھارا۔ سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ ستمبر ۱۹۸۳ء میں نمیری نے سوڈان میں اسلامی آئین کا جو مسودہ نافذ کیا اس کے پیچھے ڈاکٹر ترابی کی مساعی کام کررہی تھیں مگر جلد ہی نمیری نے ان سے اپنا تعلق ختم کرلیا اور انہیں جیل میں ڈال دیا۔ ۱۹۸۵ء میں ملک ایک اور فوجی انقلاب سے دوچار ہوا اور نمیری کو تخت و تاج سے

دست بردار ہونا پڑا۔

۱۹۸۶ء کے عام انتخابات میں ڈاکٹر ترابی کی نو تشکیل شدہ جماعت نیشنل اسلامک فرنٹ نے تیسری پوزیشن حاصل کی اور سوڈانی سیاست میں ایک ابھرتی ہوئی طاقت بن کر نمودار ہوئی۔ اگلے تین برسوں میں صادق المہدی کی مخلوط حکومت میں ڈاکٹر ترابی نے کبھی شرکت کی اور کبھی حکومت سے باہر رہے مگر انہوں نے ملک کو اسلامی ریاست کے قالب میں ڈھالنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ ۳۰ جون ۱۹۸۹ء کو ملک میں جو انقلاب آیا اس میں ڈاکٹر ترابی اور دوسری سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو کچھ مدت کے لیے پھر حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ اس وقت سے سوڈان میں ہونے والی احیائے اسلام کی جدوجہد کے پس پردہ ڈاکٹر ترابی ہی کا ہاتھ رہا ہے۔

ڈاکٹر ترابی نے علمی اور تحقیقی میدان میں کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا مگر ان کی متفرق تحریروں، مقالات اور تقریروں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قدرے لبرل خیالات کے علم بردار ہیں اور جمہوریت اور تکثیری معاشرے پر یقین رکھتے ہیں۔ سوڈان میں ہر فوجی انقلاب نے پارلیمانی جمہوریت کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے اور تمام سیاسی پارٹیوں پر قدغن لگائی جاتی رہی ہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر ترابی کے خیالات سیاسی سطح پر بڑے قابل قدر سمجھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ترابی احیائے اسلام کی جدوجہد میں رواداری اور لچک دار رویے کے علم بردار سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوڈان کی تمام حکومتیں ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کے دباؤ میں ملک کو اسلام کاری کی راہ پر گامزن کرنے میں دلچسپی لیتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر ترابی عورتوں کے حقوق کے بارے میں بہت کھل کر گفتگو کرتے ہیں اور شریعت کے دائرہ میں رہ کر حقوق نسواں کی مکمل علم برداری کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مسلم خواتین میں مغرب پرستی کی تیز و تند لہر کے پیش نظر اسلام کے لبرل تصور کی ترجمانی اور شریعت کی دی ہوئی رخصتوں سے استفادہ کرنا ایک ناگزیر ضرورت تصور کیا ہے۔

مسلم خواتین کے ساتھ ناانصافی اور استحصال کا سبب

اس پہلو پر ڈاکٹر ترابی بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں اور مسلم معاشرہ کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب اسلامی اصولوں

سے بے توجہی ہے خاص طور سے سماجی اور عائلی زندگی میں۔ جب بھی ان کے عقائد اور افکار میں کمزوری پیدا ہوئی ہے انہوں نے خواتین کے ساتھ نامناسب سلوک کیا ہے۔ ڈاکٹر حسن ترابی کی نگاہ میں خواتین کو قرآن نے تمام بنیادی حقوق سے نوازا ہے اور مردوں کو تاکید کی ہے کہ وہ ہر حال میں عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ وہ درج ذیل آیات کا اس سیاق میں حوالہ دیتے ہیں:

واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فلا تعضلوهن ان ينكحن ازواجهن اذا تراضوا بينهم بالمعروف ذلك يوعظ به من كان منكم يؤمن بالله و اليوم الآخر ذالكم ازكى لكم و أطهر والله يعلم و أنتم لاتعلمون(البقره:۲۳۲)

(جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں۔ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمہارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔)

يا ايها الذين آمنوا لايحل لكم ان ترثوا النساء كرها ولاتعضلوهن لتذهبوا ببعض ماآتيتموهن الا ان ياتين بفاحشة مبينة وعاشروهن بالمعروف فان كرهتموهن فعسى ان تكرهوا شينا ويجعل الله فيه خيراً كثيراً(النساء:۱۹)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ضرور تمہیں تنگ کرنے کا حق ہے، تم ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے ایک چیز تمہیں ناپسند ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔)

فاذا بلغن أجلهن فلاجناح عليكم فيمافعلن في أنفسهن بالمعروف والله بماتعملون خبير (البقره: ۲۳۴)

(پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں اختیار ہے کہ وہ اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں کریں۔ تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے)

واذا بُشّر أحدهم بالأنثى ظلّ وجهه مسودًا و هو كظيم يتوارىٰ من القوم من سوءِ مابُشّر به أيمسكه علىٰ هُونٍ ام يدُسّه في التراب الاسآء مايحكمون (النحل: ۵۸۔۵۹)

(جب ان میں کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور بس وہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا اس کو مٹی میں دبا دے۔ دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں)

واذا الموءدة سُئلت بأيّ ذنب قتلت (التکویر: ۸۔۹)

(اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی)

ڈاکٹر ترابی متعدد احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں اور اسی نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ جن لوگوں کا مذہبی عقیدہ کمزور ہے وہی خواتین کا استحصال کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد کی ہر حال میں برتری کا جو رجحان پرورش پا گیا ہے اس میں وہی مسلمان مبتلا ہوتے ہیں جو اللہ کے سامنے کامل سپردگی اور عبدیت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے روایتی دین داری پر مطمئن رہتے ہیں۔

غیر اسلامی روایات کا اثر

ڈاکٹر ترابی کے نزدیک خواتین کے استحصال کی دوسری وجہ دور جاہلیت کے رسوم و رواج کا باقی رہنا ہے۔ وہ ایران، ہندستان اور عرب کے مختلف معاشروں کا تقابل کرتے ہیں۔ انہیں نظر آتا ہے کہ اکثر جگہوں پر ماقبل اسلام کی رسوم اور اقدار و روایات نے اسلامی تہذیب

پر بھی پر چھائیں ڈالی ہے اور دھیرے دھیرے زوال پذیر اسلامی معاشرے نے ناواقفیت کی وجہ سے ان غیر اسلامی اقدار و روایات کو اسلام سے منسلک کر دیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان رسوم و روایات کی تائید میں اسلام سے دلیلیں بھی فراہم کی جانے لگیں۔

فقہی قوانین کی کمزور تشکیل

ڈاکٹر حسن ترابی کا یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعد کے ادوار میں بہت سے فقہی قوانین اور ضابطے اس انداز میں مرتب کیے گئے کہ کسی طرح شریعت کے دائرے میں رہ کر دوسری رسوم و روایات کو بھی زندہ رکھا جاسکے۔ مثال کے طور پر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شرعی قوانین کو رسم و رواج سے الگ ایک ضابطہ بنانے کے بجائے ان کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں عورتوں کو جو حقوق اور آزادیاں ملنی چاہئیں انہیں احتیاط کے غلط عذر کی بنا پر غصب کرنے کا سامان کر دیا جاتا ہے یا ان کے دائرہ کار کو اتنا محدود کر دیا جاتا ہے کہ ان کی اہمیت تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مردوں کو آزادیٔ حقوق اور اختیارات دینے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا جاتا ہے اور یہ خاص طور پر اس وقت ہوتا ہے جب عورتوں پر کسی طرح کی پابندی عائد کرنا مقصود ہو۔ شرعی قوانین کی ترجیح کا یہ طریقہ متعصبانہ ہے۔ ڈاکٹر حسن ترابی کے مطابق ذرائع اور وسائل کے درست ہونے کا معیار ان کے نتائج و عواقب کو قرار دینا صحیح نہیں ہے اور اس طرح حد سے بڑھے ہوئے محتاط امتناعی احکام نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے جس کا مقصد جنسی تحریص کے مزعومہ وسائل پر پابندی عائد کر کے اس کے ناپسندیدہ نتائج سے خود کو محفوظ کر لینا تھا۔ ڈاکٹر حسن ترابی کے مطابق علماء اس معاملے میں اتنے قدامت پرست واقع ہوئے ہیں کہ انہیں ڈر ہے کہ کہیں خیالات کی آزادی امت کو گمراہ کر کے اسے پارہ پارہ نہ کر دے، اور آزادیٔ نسواں کہیں پورے معاشرے کو آزادی کا باقاعدہ اجازت نامہ نہ دے دے۔

خواتین کو الگ تھلگ کرنے کی کوشش

ڈاکٹر ترابی نے عورتوں کے ساتھ ہونے والی سب سے بڑی ناانصافی یہ بتائی ہے کہ انہیں معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا گیا ہے اور جب انہیں اجتماعی پروگراموں اور منصوبوں کی

تکمیل میں حصہ بٹانے کا موقع ملتا ہے تو ان پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی آواز کو سننا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا اور کسی ایسے مقام پر جہاں مرد موجود ہوں خواتین کی موجودگی معیوب قرار دی جاتی ہے۔ اسلام نے عورتوں کے بارے میں جو قوانین بنائے ہیں ان کا غلط استعمال کر کے انہیں گھر کی چہار دیواری کے اندر بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور عام معاشرتی سرگرمیوں سے اس دلیل کے ساتھ الگ تھلگ رکھا جاتا ہے کہ عورت گھر میں رہ کر بچوں کی تعلیم و تربیت اور اپنے شوہر کی خدمت پر پوری توجہ دے سکے گی۔

اسلام کی نگاہ میں عورت کی خود مختاری

ڈاکٹر حسن ترابی عورت کو ایک خود مختار وجود مانتے ہیں جو بجائے خود ایک مکمل اور ذمہ دار شخصیت ہے کیوں کہ اسلام بغیر کسی واسطے کے عورت سے براہ راست خطاب کرتا ہے اور عقیدے اور نظرے کا اختیار کرنا مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی رضا اور رغبت کی حالت ہی میں قابل قبول اور موجب اجر و ثواب ہے۔ فاضل مصنف بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام اور رسالت پر بیعت کرنے کے عمل سے استدلال کرتے ہیں اور سورہ الممتحنہ آیت ۱۲ کو نقل کرتے ہیں۔

يا أيها النبى اذا جاء ك المؤمنات يبايعنك على ان لا يشركن بالله شيئاً ولايسرقن ولايزنين ولايقتلن أولادهن ولا ياتين ببهتان يفترينه بين أيديهن وأرجلهن ولايعصينك فى معروف فبايعهن واستغفرلهن الله إن الله غفور رحيم(الممتحنه:۱۲)

(اے نبیؐ جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی، اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔)

وہ الاصابة فی تمییز الصحابة، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری وغیرہ تاریخی مآخذ سے صحابہ و صحابیات کے مختلف واقعات کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کسی عورت کا اسلام قبول کرنا اسلامی روایات میں مکمل طور پر ذاتی نوعیت کا معاملہ ہے، کوئی تقلیدی عمل نہیں ہے۔ اس لئے اسلام کی عائد کردہ واجبات اور ذمہ داریاں اسے خود ادا کرنی ہوں گی۔ اور ان عبادات کی انجام دہی پر ثواب بھی اسی کو ملے گا۔

فاستجاب لهم ربهم انی لااضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض.(آل عمران:۱۹۵)

(جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو)

من عمل صالحاً من ذکر او انثی وهو مومن فلنحیینّه حیوة طیبة ولنجزینهم اجرهم باحسن ماکانوا یعملون(النحل:۹۷)

(جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔)

إن کل من فی السموات و الارض الا آتی الرحمن عبداً(مریم:۹۳)

زمین اور آسمان کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔

ضرب الله مثلاً للذین کفروا امرأة نوح و امرأة لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتهما فلم یغنیا عنهما من الله شیئا وقیل ادخلاالنار مع الداخلین وضرب الله مثلاً للذین آمنوا امرأة فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنة ونجّنی من فرعون وعمله و نجّنی من القوم الظالمین ومریم ابنت عمران

التی احصنت فرجها فنفخنا فیه من روحنا وصدقت بکلمت ربها و کتبه وکانت من القانتین (التحریم:۱۰۔۱۲)

(اللہ کافروں کے معاملے میں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں مگر انہوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ۔ اور اہل ایمان کے معاملے میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ جب کہ اس نے دعا کی کہ اے میرے رب میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے۔ اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تھی پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونک دی۔ اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی۔ اور وہ اطاعت گذار لوگوں میں سے تھی۔)

خواتین مردوں کی نصف ثانی

ڈاکٹر ترابی کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں عورتوں کے احکام ومسائل بالکل ہی جداگانہ نہیں ہیں البتہ بعض ذیلی اور محدود نوعیت کے مسائل ایسے ہیں جہاں مرد اور عورت دونوں صنفوں میں تفریق کی گئی تاکہ اپنی اپنی فطرت کے مطابق وہ ایمانی ہدایات پر عمل کر سکیں مگر جوہری اعتبار سے شریعت دونوں کے لئے ایک ہی ہے اور اس کے عام ضابطے دونوں صنفوں کے لیے یکساں ہیں۔ ڈاکٹر ترابی شریعت کے اسی بنیادی اصول پر زور دیتے ہیں کہ صنف کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے سوائے ان معاملات کے جن میں دونوں کے درمیان تفریق کے لیے الگ سے نص موجود ہے۔ سماجی معاملات واخلاقیات حتی کہ عوامی زندگی میں بھی خواتین سے بھرپور کردار ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ ہجرت وجہاد کے تمام مراحل میں وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ قرآن پاک کا اعلان ہے:

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر و يقيمون الصلوٰة و يوتون الزكوٰة

ویطیعون اللہ و رسولہ اولئک سیرحمھم اللہ ان اللہ عزیز حکیم (التوبۃ:۷۱)

(مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے)

إن المسلمين و المسلمات و المؤمنين و المؤمنات والقانتين والقانتات والصادقين والصادقات والصابرين و الصابرات والخاشعين والخاشعات والمتصدقين والمتصدقات والصائمين والصائمات والحافظين فروجهم والحافظات والذاكرين الله كثيرا والذاكرات اعد الله لهم مغفرة و اجرا عظيما(الاحزاب:۳۵)

(بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔)

سماجی اور دفاعی معاملات میں خواتین کی شرکت

ڈاکٹر ترابی ازواج مطہرات اور صحابیات کے واقعات نقل کرتے ہیں اور اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مسلمان عورتیں اسلامی تاریخ میں فوجی خدمات بھی انجام دیتی رہی ہیں جیسے پیاسے مجاہدوں کو پانی پلانا، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، ان کو محفوظ جگہ پر لے جانا اور کبھی کبھی خود بھی عملاً جنگ میں شریک ہونا۔ وہ حضرت عائشہؓ، ام سنان الاسلمیہؓ، امیہ بنت قیسؓ، حمنہ بنت جحشؓ، ربیع بنت معوذؓ، ام ضحاک بنت مسعودؓ، صفیہ بنت عبدالمطلبؓ، نصیبہ بنت کعب اور ام حرام بنت ملحانؓ وغیرہ کی دفاعی اور جنگی خدمات کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں اور آخر میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دفاع اور عوامی زندگی کی دوسری اجتماعی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی میں مسلمان

عورت حصہ لے سکتی ہے البتہ یہ ان پر فرض نہیں ہے الّا یہ کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں ان کی شرکت ناگزیر ہو۔

ڈاکٹر ترابی کے مطابق اسلام میں عورتوں کو اظہار خیال کی پوری آزادی حاصل ہے۔ حضرت عائشہ اپنے فقہی خیالات میں معروف ہیں۔ عورت اپنی جائداد کی خود مختار ہوتی ہے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی طرح استعمال کر سکتی ہے۔ شریعت نے عام طور پر عورت اور مرد دونوں کے لیے مناسب اور مساوی قانون بنایا ہے۔ وہ خاندان کے انتظامی معاملات میں شرکت کر سکتی ہے حالاں کہ خاندان کی کفالت اس کے فرائض میں شامل نہیں ہے اور خارجی مصروفیات میں مشترکہ آمدنی کے لیے اپنے شوہر کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔

ڈاکٹر ترابی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ میاں بیوی کو خاندانی معاملات میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنا چاہیے اور ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔

والوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين لمن اراد ان يتم الرضاعة وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف لاتكلف نفس الا وسعها لاتضار والدة بولدها ولامولود له بولده وعلى الوارث مثل ذلك فان اراد فصالا عن تراض منهما وتشاور فلاجناح عليهما وان اردتم ان تسترضعوا اولادكم فلاجناح عليكم اذا سلمتم ما آتيتم بالمعروف واتقوا الله واعلموا ان الله بماتعملون بصير (البقرة:۲۳۳)

(جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیے، تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے، اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے ـــ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا کہ بچے کے باپ پر ہے، ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے ـــ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں

تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو، تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے)

وہ اس بات کے قائل ہیں کہ مسلم معاشرے میں عورت کو مجلس شوریٰ یا اسمبلی اور پارلیمنٹ کا رکن بنایا جاسکتا ہے، وہ انتظامیہ کے مختلف عہدوں پر بھی فائز ہو سکتی ہے: خواہ یہ تقرری الیکشن کے ذریعے ہو یا مشاورت کے ذریعے۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے موقع پر شورائی عمل کے تذکروں سے اس کی مکمل توثیق ہوتی ہے۔ اس عام مشاورتی مسئلے میں عورتیں بھی شریک ہوئی تھیں۔ انہوں نے البدایة والنهایة سے ابن کثیر کا یہ اقتباس بھی نقل کیا ہے:

> اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف نے دو امیدواروں، عثمان بن عفان اور علی ابن ابی طالب کے بارے میں لوگوں سے رائے لینی شروع کی۔ وہ خلیفہ کے انتخاب میں مسلمانوں کے عمومی رجحان سے متعلق معلومات یکجا کر رہے تھے۔ انہوں نے اجتماعی اور انفرادی دونوں سطح پر اس سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ حتیٰ کہ درون خانہ عورتوں سے بھی صلاح و مشورہ لیا۔

ڈاکٹر ترابی کہتے ہیں کہ ابتدائی دور کے مسلم معاشرے میں یہ روایت عام تھی کہ عورتیں تمام عوامی جلسوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ وہ عہد رسالت میں حضرت عائشہؓ کے حبشیوں کا کھیل دیکھنے کے واقعے سے استدلال کرتے ہیں اور مرد اور عورت دونوں سے اجتماعی عبادات میں شریک ہونے کی توقع کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتمنعوا اماء الله من المساجد

(عورتوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکو۔)

اس حدیث کو سن کر عبداللہ ابن عمر کے کسی بیٹے نے اپنے باپ سے کہا کہ ہم خطرات کے پیش نظر عورتوں کو رات میں گھر سے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ حضرت ابن عمر نے

اس پر اپنے بیٹے کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ میں کہتا ہوں کہ اللہ کے رسولؐ نے ایسا فرمایا اور تم بدستور یہ کہہ رہے ہو کہ ہم ان کو نہیں جانے دیں گے۔ (مسلم)

ڈاکٹر ترابی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ یہ تھا کہ عورت مسجد میں بلا تکلف جا سکتی ہے حتی کہ رات میں بھی جا سکتی ہے اور عید گاہ میں جا کر عید کی نماز ادا کر سکتی ہے۔

حجاب کا حکم ازواج مطہرات کے لئے مخصوص

ڈاکٹر ترابی حکم حجاب کو ازواج مطہرات کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں کیوں کہ وہ تمام عورتوں کے مقابلے میں برتر مقام کی حامل تھیں اس لئے ان کی ذمہ داریاں بڑھی ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عام عورتوں کے مقابلے میں ان کو ثواب بھی دوگنا ہوگا، اور عذاب بھی۔ قرآن میں ہے:

يانساء النبى من يأت منكن بفاحشة مبينة يضعف لها العذاب ضعفين وكان ذلك على الله يسيرا و من يقنت منكن لله و رسوله و تعمل صالحاً نؤتها اجرهامرتين و اعتدنا لها رزقاً كريماً (الاحزاب:٣٠۔٣١)

(نبیؐ کی بیویو، تم میں سے جو کسی صریح فحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا، اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے اور ہم نے اس کے لیے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے۔)

اس سورہ کی دوسری آیات میں یہ حکم ہے کہ ازواج مطہرات اپنے حجروں میں پردے لٹکا دیں (تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے والوں سے علیحدگی نصیب ہو) اور یہ کہ وہ پورا لباس پہنیں۔ چہرے اور ہاتھ سمیت پورے بدن کو دوسرے مردوں سے چھپا رکھیں جب کہ دوسری مسلمان عورتیں ان بندشوں سے مستثنیٰ ہیں، قرآن میں ہے:

ياايها الذين آمنوا لاتدخلوا بيوت النبى الا ان يوذن لكم الى

طعام غيرناظرين اناهُ ولكن اذا دعيتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولامستأنسين لحديث إن ذٰلكم كان يوذى النبى فيستحى منكم والله لايستحى من الحق واذا سألتموهن متاعا فسئلوهن من ورآء حجاب ذٰلكم اطهر لقلوبكم و قلوبهن وماكان لكم ان تودوا رسول الله ولا أن تنكحوا أزواجه من بعده ابدا إن ذٰلكم كان عند الله عظيما(الاحزاب:۵۳)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نبیؐ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ۔ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمہاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔)

ڈاکٹر ترابی کہتے ہیں کہ اس حکم کا متن واضح طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ تک محدود ہے۔ جیسے آپ کی ازواج سے گفتگو کرنا، یا آپ کے وصال کے بعد ان سے نکاح کی ممانعت وغیرہ۔ ان آیات کی شان نزول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک صحیح حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم حضرت عمر ابن الخطاب کے مشورہ دینے کے بعد نازل ہوا تھا۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ازواج مطہرات پردہ کریں، لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ تب آیت حجاب نازل ہوئی۔ (بخاری)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے: "میرے اللہ نے میری تین خواہشات پوری کی ہیں: میں نے رسولؐ سے مقام ابراہیم میں عبادت کرنے کی اجازت

مانگی، اس پر آیت نازل ہوئی (واتخذوا من مقام ابراهیم مصلیٰ) میں نے آپؑ سے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ کی ازواج سے ملنے کے لیے ہر کوئی اندر داخل ہو جاتا ہے۔ آپ ان کو دور رکھنے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ اس کے فوراً بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔ اسی طرح ازواج مطہرات حسد کی کمزوری سے مغلوب ہو کر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑتی تھیں تو میں نے ان سے کہا اور جو کچھ کہا، اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نازل فرمایا۔ آیت یہ ہے۔

عسی ربه ان طلقکن ان یبدّله ازواجاً خیراً منکن مسلمات مومنات قانتات عابدات سائحات ثیبات وابکاراً (التحریم:۵)

(بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرمادے جو تم سے بہتر ہوں، سچی مسلمان، باایمان، اطاعت گزار، توبہ گزار، عبادت گزار، اور روزہ دار، خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ)

احکام حجاب کی شان نزول میں وہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جب حضرت زینب بنت جحش کے نکاح کی دعوت ولیمہ میں بعض صحابہ کرام اتفاقاً دیر تک بیٹھے رہ گئے تھے۔ ابن شہاب روایت کرتے ہیں کہ انس بن مالک نے ان کو یہ روایت سنائی کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، اس وقت میری عمر دس سال کی تھی اور میں نے دس سال تک ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ حجاب سے متعلق آیات کے سلسلے میں کسی کو بھی اتنا علم نہیں تھا جتنا کہ مجھے تھا۔ ابی بن کعب مجھ سے نبی کریمؐ کے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے تھے۔ نبی کریمؐ نے لوگوں کو صبح کے وقت کھانے پر طلب کیا۔ اکثر لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر چلے گئے۔ البتہ کچھ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر ذرا دیر تک بیٹھے رہے۔ نبی کھڑے ہوئے اور باہر تشریف لے گئے۔ میں نبیؐ کے پیچھے پیچھے چلا، وہ سیدھے حضرت عائشہؓ کے حجرے کی دہلیز پر پہنچے، پھر یہ سوچ کر کہ شاید وہ لوگ چلے گئے ہوں واپس آئے، لیکن وہ لوگ موجود تھے اس لئے پھر لوٹ گئے۔ میں پھر پیچھے پیچھے چلا، آپؑ دوبارہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کی دہلیز تک آئے اور پھر یہ سوچ کر کہ شاید اب وہ لوگ چلے گئے

ہوں، واپس لوٹے تو وہ لوگ جا چکے تھے۔ اس واقعے کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی اور فوراً ہی میرے اور نبیؐ کے حجرے کے درمیان چادر تان دی گئی۔ (بخاری)

ڈاکٹر حسن ترابی کہتے ہیں کہ عام مقامات پر دوسرے لوگوں سے علیٰحدہ ہٹ کر مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے پرائیویٹ گفتگو کر سکتے ہیں اور اس کا استدلال وہ اس حدیث سے کرتے ہیں:

حضرت انس سے مروی ہے کہ ایک عورت، جو کسی قدر ذہنی کمزوری میں مبتلا تھی، آپ کے پاس آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ نبیؐ نے فرمایا: اے فلاں بنت فلاں! بتاؤ کیا کام ہے؟ اور اس کے ساتھ کچھ دور تک گئے۔ وہاں اس نے اپنی ضرورت بیان کی۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

ڈاکٹر ترابی اس مسئلے کی مزید توضیح حضرت موسیٰؑ اور شعیبؑ کی دو بیٹیوں سے متعلق قرآن میں مذکور واقعے سے کرتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

ولمّا ورد ماء مدين وجد عليه امّة من الناس يسقون ووجد من دونهم امراتين تذودان قال ماخطبكما قالتا لانسقى حتىّ يصدر الرعاء وأبونا شيخٌ كبيرٌ فسقى لهما ثم تولّى الى الظل فقال رب إنى لما أنزلت الى من خيرٍ فقير فجاء ته احديهما تمشى على استحياء قالت ان ابى يدعوك ليجزيک اجر ماسقيت لنا۔ فلما جاء ه و قص عليه القصص قال لاتخف نجوت من القوم الظالمين۔ قالت احديهما يأبت استأجره إن خير من استاجرت القوىُ الأمين
(القصص:٢٣_٢٦)

(اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰؑ نے ان عورتوں سے پوچھا تمہیں کیا پریشانی ہے؟ انہوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں، اور ہمارے والد ایک بہت

بوڑھے آدمی ہیں۔ یہ سن کر موسیٰ نے ان کے جانوروں کو پانی پلادیا، پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھے اور بولے "پروردگار، جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کردے میں اس کا محتاج ہوں۔ (کچھ دیر نہ گزری تھی کہ) ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم وحیا کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے والد آپ کو بلارہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں۔ موسیٰ جب اس کے پاس پہنچے اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا "کچھ خوف نہ کرو، اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو")

سلام کرتے وقت بغیر ارادے کے عورت سے ہاتھ ملانے کا جواز

ڈاکٹر ترابی کہتے ہیں کہ عورت کو سلام کرتے وقت بغیر ارادے کے ہاتھ ملانا جائز ہوسکتا ہے، خاص طور سے اس وقت جب کہ معاشرے میں اس کا رواج ہوچکا ہو۔ ایسی بہت ساری روایات موجود ہیں جن میں "اجنبیہ کو چھونے" کی ممانعت آئی ہے۔ لیکن چھونا یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ کا پس منظر جنسی مباشرت سے عبارت ہے محض چھونے سے نہیں۔ اور اس کے استدلال میں وہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ:

جب عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کے لئے آتی تھیں تو آپ اُن سے مصافحہ نہیں فرماتے تھے۔ بظاہر یہ آپ کی خصوصیت تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ دوسری روایات میں یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ پر کپڑا باندھ کر عورتوں سے مصافحہ کرتے تھے۔ ابوداؤد، الشعبی اور عبدالرزاق سے روایت ہے کہ کبھی کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کے لیے حضرت عمر کو متعین فرمایا کرتے تھے۔ (طبرانی)

تجزیہ

ڈاکٹر حسن ترابی کے یہ افکار وخیالات تحریک اسلامی کی تاریخ میں ترقی پسندانہ رجحانات کے حامل نظر آتے ہیں اور ان میں سے بہت سے نکات اسلام کے روایتی تصور اور اجماعی نظریہ سے ہٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اسی لیے ان افکار و نظریات پر خود تحریک اسلامی کے حلقوں سے سخت تنقیدیں بھی ہوئی ہیں جن میں سے زیادہ ترصحیح اور مناسب معلوم ہوتی

ہیں مگر اس ضمن میں چند امور غور طلب ہیں۔

۱۔ یہ خیالات کسی عام مسلمان کے نہیں تحریک اسلامی سوڈان کے اس قائد کے خیالات ہیں جنہوں نے اسلام اور مغرب دونوں کا براہ راست مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے، جن کی اسلام سے وابستگی پوری واضح ہے اور جو سوڈان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کر رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں متعدد بار قید و بند کی یوسفی سنت بھی ادا کر چکے ہیں۔

۲۔ ڈاکٹر ترابی اپنے ان خیالات و نظریات کی وجہ سے سوڈان کی خواتین میں کافی مقبول و محترم سمجھے جاتے ہیں اور انہوں نے تعلیم یافتہ خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد کو غلبۂ اسلام کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

۳۔ قرآن کریم کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے نصوص ناقابل تغیر ہیں، ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی قیامت تک نہیں کی جا سکتی۔ البتہ ان نصوص کو سمجھنے کی جو انسانی کوششیں ہوئی ہیں اور ہر دور میں اس کی جو تعبیریں کی ہیں وہ بہر حال معصومانہ نہیں ہیں۔

(ڈاکٹر حسن ترابی کے مذکورہ بالا افکار و نظریات کا عربی سے اردو میں ترجمہ ماہنامہ زندگی نو، دہلی کے شماروں مئی، جون، اگست ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ جناب مفتی محمد مشتاق تجاروی نے کیا ہے۔ فاضل مترجم کی شکر گذار ہوں جن کی کوششوں سے ان افکار و خیالات سے شناسائی ہوئی)

زلفی وقار

ترجمہ: اخلاق احمد آہن

روس کے سیاسی افق پر اسلام کی واپسی

آج روسی وفاق کی حدود میں تقریباً سوا دو کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ الگونڈر بنکسن (Alexander Bennigsen) کے مطابق سابق سوویت یونین، انڈونیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندستان کے بعد پانچویں بڑی مسلم قوت ہے لیکن اس کے باوجود روسی مسلمان سب سے پہلے ایک مسیحی طاقت سے مغلوب ہوئے۔ (۱)

سویت عہد میں اسلام کو پوری طرح عوامی زندگی سے الگ تھلگ کردیا گیا تھا۔ مساجد، مدارس اور دوسرے مذہبی ادارے بڑے ڈرامائی انداز سے ختم کردیئے گئے تھے۔ تمام مذہبی معاملات حکومت کے زیر نگرانی آگئے تھے۔ غیر روسی نسل کے لوگوں میں معمولی درجے کی مذہبی یا قومی بیداری کو بھی متشددانہ قوم پرستی اور بنیاد پرستی تصور کیا جاتا تھا۔

سوویت یونین کے زوال کے بعد اسلام دوبارہ روس کے سیاسی افق پر ابھرتا نظر آرہا ہے۔ مذہبی نشاۃ الثانیہ کے باعث مذہبی بنیادوں پر تنظیمیں قائم کی جارہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی مذہبی بیداری اور قومی جذبات نے روسی وفاق کے مسلمانوں کو مذہبی اور نسلی سیاست کی بنیاد پر متحد کردیا ہے۔ مسلمانوں کی پہلی سیاسی پارٹی 'اسلامی نشاۃ الثانیہ پارٹی یا Islamic Renaissance Party (IPV 'روسی مخفف) ۱۹۹۰ء میں قائم ہوئی۔ اس پارٹی نے خود کو سوویت یونین کے تمام مسلمانوں کے مفادات کا ترجمان بنایا۔ اس کا اولین مقصد سوویت یونین کی پارلیمنٹ (ڈیوما) میں مسلمانوں کے ایک گروپ کا قیام کرنا تھا جیسا کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے ڈیوما میں ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۹۱ء کے اوائل میں IPV مسلمانوں میں بہت مقبول ہوگئی اور اس پارٹی نے وسط ایشیا کی کئی

جمہوریاؤں اور قفقاز (Caucasus) میں اپنی بے شمار شاخیں قائم کرلیں (۲)

سوویت یونین کے زوال کے بعد قومی خود مختاری کے تصور نے تمام جمہوریاؤں میں زور پکڑلیا، ساتھ ہی روس میں اسلامی مفادات نے بھی ایک نیا رخ اختیار کیا۔ تاتارستان میں اعلان آزادی کے بعد، متعدد نو تشکیل شدہ سیاسی جماعتوں اور تحریکوں مثلاً اتفاق، ایمان یوتھ اسلامک کلچرل سنٹر، ساف اسلام گروپ (SAF Islam Group) نے اسلام کو تاتار قوم کی نسلی شناخت کی بنیاد قرار دیا اور وہاں کی قومی بیداری میں اسلام کی اہمیت پر زور دیا۔ Chuvashiya اور بخارستان میں مسلم یونینیں قائم ہوئیں۔ مسلمانوں کی متعدد سیاسی جماعتیں شمالی قفقاز خاص طور سے داغستان اور چیچنیا میں قائم ہوئیں جہاں اسلامک ڈیموکریٹک پارٹی (Islamic Demoratic Party) اور اسلامک وے پارٹی (Islamic Way Party) بہت سرگرم تھیں۔ (۳) اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے بھی اسلام کی عمومی مقبولیت کا واضح اشارہ ملتا ہے، مثلاً داغستان میں مساجد کی تعداد ۱۹۸۸ء میں ۲۷ تھی جو ۱۹۹۴ء میں بڑھ کر پانچ ہزار ہو گئی جب کہ تاتارستان میں ۱۹۸۸ء میں ۱۲ مساجد تھیں، جن کی تعداد ۱۹۹۸ء میں بڑھ کر تین سو ہو گئی۔ (۴) وولگا (Volga) علاقے کے مسلمانوں نے ۲۹۔۳۰/اکتوبر ۱۹۹۴ء کو منعقدہ ایک جلسے میں روسی وفاق کے صدر سے اپیل کی کہ اسلام کو روس کی قومی تاریخ کا ایک حصہ تسلیم کیا جائے۔ (۵) اسلامی نشاۃ الثانیہ کے سلسلے میں روسی سماج کا رویہ نرم لیکن سرد مہری کا رہا۔ ایک عام روسی کے خیال میں اسلام پسماندگی، بنیاد پرستی حتیٰ کہ دہشت پسندی کی علامت رہا ہے، لیکن ان سب کے باوجود، اسلام اپنے ماننے والوں میں قومی ثقافت کی بنیاد اور ایک نظام حیات کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔

اگرچہ تمام مسلم علاقوں میں اسلامی وراثت کے بارے میں بیداری عام ہو رہی ہے لیکن جمہوریاؤں نے کوئی ایسا عندیہ ظاہر نہیں کیا ہے جس سے یہ تاثر ملے کہ وہ مذہبی بنیادوں پر کوئی سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں۔ مسلمانوں کو ایک علیحدہ سیاسی طاقت بنانے کے ایجنڈے کے تحت ۱۹۹۵ء میں ڈیوما (State Duma) کے انتخابات کے موقع پر نئی سیاسی پارٹیاں بنیادی طور

پر مسلمانوں کے مفادات کی نقیب کی حیثیت اور "روسی وفاق میں رہنے والے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشی حقوق کے تحفظ" کی غرض سے قائم ہوئیں۔ آج کل روس میں سرکاری طور پر تسلیم شدہ صرف دو سیاسی پارٹیاں کام کر رہی ہیں۔ دی یونین آف مسلمز آف رشا (The Union of Muslims of Russia) اور آل رشن مسلم سوشیو پالیٹکل موومنٹ 'نور' (All Russian Muslims Socio-Political Movement "NUR")

دی یونین آف مسلمز آف رشا

دی یونین آف مسلمز آف رشیا کی تشکیل ۳۱ر مئی ۱۹۹۵ء کو ہوئی اور جون ۱۹۹۵ء میں حکومت نے اسے باضابطہ طور پر سیاسی پارٹی تسلیم کر لیا۔ یہ پارٹی خود کو ایک سیکولر پارٹی کہتی ہے اور بنیاد پسندی کی حمایت نہیں کرتی۔ یونین آف رشن مسلمز کا سیاسی مقصد "ملک کے وفاقی شعبوں اور عوامی و سیاسی زندگی کے تمام حلقوں میں مسلمانوں کی مساوی اور متناسب نمائندگی" حاصل کرنا ہے۔ اس پارٹی کی اعلیٰ و انتظامی میٹنگ میں جو یکم تا ۳ر ستمبر ۱۹۹۵ء کو ماسکو میں منعقد ہوئی ۶۳ مختلف علاقوں سے ۲۵۰ مندوبین نے حصہ لیا۔ (۶) اس پارٹی کے صدر عبدالواخت نیازوف (Abdulvakht Niyazov) سیاسی حلقوں میں یلتسن نواز کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ یونین آف مسلمز آف رشا خود کو انقلاب روس سے قبل کی سیاسی جماعت مسلم یونین پارٹی، جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء کے درمیان متحرک تھی، کی جانشین سمجھتی ہے مگر اس کے سیاسی مطالبات اپنی پیشرو جماعت کے مقابلے میں بہت محتاط اور معتدل ہیں۔ اس کے سیاسی ایجنڈے میں خاص طور سے ثقافتی اور معاشی مسائل شامل ہیں مثلاً مسلم تاجروں کی وسیع پیمانے پر معاشی امداد، مسلمانوں کی زمینوں میں سرمایہ کاری، مسلمانوں کے مذہبی اہمیت کے دنوں کو سرکاری تعطیل کے طور پر قبول کیا جانا وغیرہ۔ (۷)

دی یونین آف مسلمز آف رشا سیاسی اور قومی مسائل میں دلچسپی نہیں لیتی۔ روسی حکومت کی سیاسی پائیداری اور علاقائی سالمیت کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے، کیوں کہ اس کا سیاسی رشتہ روسی انتظامیہ کے ساتھ باہمی تعاون کا ہے۔ یہ پارٹی اپنے پروگرام میں روسی مملکت اور انتظامیہ کے ساتھ اپنی قربت پر زور دیتی ہے۔ (۸) اپنے سیاسی منشور میں یونین آف مسلمز

آف رشا اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ ”تمام روسی مسلمانوں کے استحکام کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی جو روس کی اقتصادی اور سیاسی بہبود سے منسلک ہے۔“ اس اعلانیے میں مزید کہا گیا ہے کہ ”یونین متحدہ روس کی سالمیت، روس کے تمام مسلمانوں کے اتحاد اور قول و عمل کی یکسانیت کی حامی ہے۔“ (۹) یونین کے تاسیسی اجلاس میں جو فیصلے سب سے پہلے کئے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ موجودہ روسی صدر پارٹی کے نقطۂ نظر سے سب سے عمدہ رہنما ہیں۔ (۱۰) یونین کے سیاسی مطالبات عام اور سادہ لفظوں میں اس طرح ہیں: روسی وفاق میں رہنے والے مسلمانوں کے وسیع سیاسی اور اقتصادی مفادات کا حصول..... ، حکومت کی طرف سے اسلام کے روحانی احیاء کے مقاصد کا حصول جو روسی مملکت میں رہنے والے متعدد لوگوں کا عقیدہ ہے۔ (۱۱) لیکن اس پروگرام میں کسی ٹھوس لائحہ عمل کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

انقلاب سے قبل کی مسلم پارٹی کی دستاویزات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ بہت اہم اور حساس نوعیت کے مسائل مثلاً روس کے وفاقی ڈھانچے، مسلم علاقوں کی سیاسی اور ثقافتی خود مختاری، لازمی فوجی خدمات کی منسوخی اور ایک قومی فوج کی تشکیل وغیرہ کو بہت اہمیت دی تھی۔ (۱۲)

پہلی آل رشن مسلم کانگریس کے دوران متعدد مسلم مندوبین نے اس بنیاد پر روس کے وفاقی ڈھانچے کے خلاف کھل کر اظہار خیال کیا تھا کہ اس کے سبب ترکی نسل کے لوگ منقسم ہو جائیں گے۔ مسلم کانگریس میں، جو ماسکو اور کازان میں ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوئی تھی، ایک قرارداد یہ بھی منظور کی گئی تھی:۔

> ”علاقائی وفاق قومی مسئلے کو حل نہیں کر پائے گا۔ اس کی بجائے یہ وفاق بے شمار علاقائی مسئلے کھڑے کر دے گا۔ اگر اس وفاقی تقسیم کو بغور دیکھا جائے تو (واضح ہو جاتا ہے کہ) وفاق میں روس کے مسلمانوں کے تعلقات ایک دوسرے سے منقطع ہو جائیں گے۔ لاکھوں مسلمان جو روسی صوبوں کے اندر چلے جائیں گے، انہیں روسی ثقافت کے زیر اثر لایا جائے گا۔ علاقائی وفاق مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو منتشر کر دے گا اور ثقافتی طور پر مسلمانوں

> کے مختلف گروپ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اس ثقافتی علیٰحدگی کے سبب مختلف ترکی النسل لوگ غیر ترکوں سے الگ تھلگ پڑ جائیں گے۔"(۱۳)

انقلاب سے قبل کی 'مسلم یونین' خالص مذہبی مسائل پر زور دیتی تھی اور مسلم۔ ترک شناخت کے تحفظ کے بارے میں بھی بہت فکر مند تھی۔ ثقافتی خود اختیاری کے بارے میں اس کا نظریہ یہ تھا:۔

> "قومی مسائل کو صرف مسلمانوں کی قومی ثقافتی خود مختاری اور ایک ایسی قومی ثقافتی مسلم پارلیمنٹ کی تشکیل کی بنیاد پر ہی حل کیا جاسکتا ہے، جو ہمہ گیر، مساوی اور رازدارانہ حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کی گئی ہو......
>
> .... پرائمری اسکولوں میں تعلیم کا ذریعہ لازمی طور پر وہاں کی مقامی زبان ہونی چاہیے، سیکنڈری اسکولوں میں عام ترکی زبان لازمی قرار دی جانی چاہیے جب کہ ہائی اسکولوں میں ذریعہ تعلیم صرف ترکی ہو...... اگر مسلم طلباء کی تعداد دوسری قوم کے علاقے میں تین تک پہنچ جائے تو انہیں لازمی طور پر ان کی علاقائی زبان میں تعلیم دی جائے اور مذہبی تعلیم حکومت اور مقامی انتظامیہ کے خرچ پر دی جائے......."(۱۴)

یونین آف مسلمز آف رشا اس طرح کی انتہا پسندی سے بہت دور ہے۔ یہ پارٹی صرف اپنے کلچرل پروگراموں میں غیر مسلم علاقوں میں رہنے والے قومی اور مذہبی فرقوں کی ثقافتی خود مختاری کا ذکر کرتی ہے۔ ابتدا میں کئی سیاسی تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ یونین آف مسلمز آف رشا روسی پارلیمنٹ میں نشستیں حاصل کرنے یا کم از کم روس کے مقتدر مسلم سیاست دانوں کو اقتدار میں حصہ دلانے کی غرض سے قائم کی گئی ہے، تاکہ وہ روس کی مسلم اقلیتوں کی بخوبی نمائندگی کر سکیں، لیکن یونین کی ابتدائی سرگرمیاں اس کے برخلاف تھیں۔ دسمبر کے پارلیمانی انتخابات میں ناکامی کے بعد، یونین نے اپنے حامیوں کو چرنومردین کی پارٹی Our Home is Russia کو ووٹ دینے کی اپیل کی۔ (۱۵) حالیہ صدارتی انتخابات کے وقت بھی حالات ویسے

ہی تھے۔ یونین نے حالیہ صدارتی انتخابات میں شامل واحد مسلم امیدوار امان تولیف (Aman Tuleyev) کی حمایت کرنے سے انکار کردیا اور ان کی جگہ یلتسن کی امیدواری کی پرزور حمایت کی۔ (۱۷) یلتسن اور ان کی ٹیم نے اس کے بدلے یونین آف مسلمز آف رشا کی پروپیگنڈہ سرگرمیوں کے لئے "مناسب حالات" پیدا کئے۔ اس قسم کی حکمت عملی نے یونین کے اصل عزائم کے بارے میں گہرے شکوک وشبہات پیدا کردیئے۔ تمام جمہوری اور وطن پرست پارٹیوں نے یلتسن اور ان کے وزیراعظم کی چیچنیا کے معاملے میں رجعت پسندانہ اور سخت گیر پالیسی کی تنقید کی۔ یونین کی طرف سے یلتسن کو جاری حمایت کی مخالفت کرتے ہوئے احتجاجاً پارٹی کے سکریٹری مکتداس بیبارسوف (Mukatadas Bibarsov) نے استعفیٰ دے دیا۔ (۱۷)

اپنے سیاسی طرز عمل کے ایک غیر مستحکم دور کے باوجود، عملی طور پر یونین آف رشن مسلمز نہایت فعال اور بڑی سرعت سے ترقی کرتی ہوئی تنظیم ثابت ہوئی ہے۔ اس کی علاقائی شاخیں روز افزوں ہیں۔ یونین آف مسلمز آف رشا نے اپنے ماہرین اور مشیروں کو باضابطہ مختلف پارلیمانی کمیشنوں اور کمیٹیوں میں مقرر کرلیا ہے۔ قانون ساز ادارے میں اس کے براہ راست عمل دخل کے سبب اس پارٹی کو قانون سازی کے عمل میں حصہ لینے کا خاطر خواہ موقع فراہم ہوتا ہے۔ یکم مارچ ۱۹۹۶ء کو یونین آف رشن مسلمز نے روس۔ آذربائیجان سرحد کے مسئلے پر ایک علاقائی کانفرنس شہر Derbast میں منعقد کی۔ یہ سرحد Lezgin قوم کے آٹھ لاکھ لوگوں کو دو مختلف صوبوں میں منقسم کرتی ہے۔ اس کانفرنس کے دوران جنوبی داغستان کے مندوبین نے یونین آف مسلمز آف رشا کو Lezgin قوم کے لوگوں کی طرف سے موجودہ سرحد کی قانونی حیثیت کے سلسلے میں روسی اور آذربائیجانی اہل کاروں سے مذاکرات کا پورا اختیار دیا۔ (۱۸) آج ماسکو Lezgin قوم کے لوگوں کے مسائل اور "آذربائیجان میں رہنے والے Lezgin لوگوں کی اپنے روسی اعزہ واقارب کے ساتھ یکجا ہونے کی خواہش" کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کررہا ہے اور اس کے ذریعے آذربائیجان کو روس کے ساتھ قریبی اقتصادی تعلقات قائم رکھنے پر مجبور کررہا ہے۔ Lezgin لوگوں کے گہرے مذہبی جذبات کو دھیان میں

رکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روسی حکومت نے اپنی پالیسیوں پر عمل درآمد کے لئے یونین آف مسلمز آف رشا کی صورت میں ایک معتبر آلہ کار دریافت کر لیا ہے۔.....

آل رشن مسلم سوشیو۔پالیٹیکل موومنٹ ''نور''

''نور'' آل رشن مسلم سوشیو۔پالیٹیکل موومنٹ، مسلمانوں کی ایک اور سیاسی پارٹی ہے جو مذہبی خطوط پر قائم ہے۔ ''نور'' کا قیام ۱۶/جون ۱۹۹۵ء کو ہوا۔(۱۹) یہ سرکاری طور پر مسلمانوں کی دوسری بڑی رجسٹرڈ پارٹی ہے جسے انتخابات میں حصہ لینے کا قانونی حق حاصل ہے۔ عام طور پر ''نور'' کا سیاسی پلیٹ فارم یونین آف مسلمز آف رشا سے مماثل ہے۔ ''نور'' اپنے وسیع سیاسی پروگرام کے علاوہ میں قانون سازی، عسکری، اقتصادی، تعلیمی، ثقافتی، اخلاقی اور ماحولیاتی مسائل سے متعلق ذیلی پروگرام بھی رکھتی ہے۔ ''نور'' نے مقامی شاخوں کے علاوہ ''آرگنائزیشن آف مسلم ویمن اینڈ یوتھ'' (Organisation of Muslim Women and Youth) بھی قائم کی ہے، جس کے ذمے ثقافتی اور تعلیمی پروگرام ہیں اور جو دوسرے مسائل جیسے حفظان صحت، کھیل کود، شرح پیدائش اور زچہ وغیرہ کی دیکھ بھال سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ یونین آف رشن مسلمز کے مقابلے میں ''نور'' کی مقبولیت زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس نے اب تک ۶۰ سے زائد شاخیں قائم کر لی ہیں۔ اس پارٹی کے صدارتی بورڈ میں روس کے مختلف علاقوں کے نمائندوں کی حیثیت سے ۱۳/افراد شامل ہیں۔ ''نور'' کا اعلیٰ ترین مشاورتی عضو، مجلس بزرگان یا Council of Elders (روسی میں Soviet Stareyshin) ہے، جسے فہم و فراست اور مسلم روایات کی پاسداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔(۲۰) ڈیوما کے حالیہ انتخابات میں ''نور'' نے ۶۹ فی صد ووٹ پا کر انتخابات میں شامل ۴۳ تسلیم شدہ سیاسی پارٹیوں میں ۲۲واں مقام حاصل کیا تھا۔(۲۱) اقلیتی طبقے کی ایک نوزائیدہ مذہبی پارٹی کے لئے یہ کارکردگی بہت بری نہیں کہی جا سکتی۔ اس پارٹی کے صدر ایک نوجوان مذہبی شخصیت وفا یارولین (Vafa Yarullin) ہیں (ابھی تک ان کی شخصیت روس کے قومی اور مقامی سیاسی حلقوں میں بہت جانی پہچانی نہیں ہے) جو پارٹی کے سابق صدر اخامد یاخن (Akhamed Yakhin) کے مستعفی ہونے کے بعد منتخب ہوئے ہیں، جن پر لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے نائب کی حمایت کا الزام

تھا۔ (۲۲) روس کے صدارتی انتخابات میں یونین آف رشن مسلمز پارٹی کے برعکس ”نور“ نے لبرل ریفارمسٹ گریگوری یاف لنسکی (Gregori Yavlinsky) کی حمایت کی۔ (۲۳) اس پارٹی کے سیاسی دستور العمل میں کہا گیا ہے کہ ”نور“ جمہوریہ روس کے قومی مفادات کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ یہ پارٹی انسانی حقوق کی خلاف ورزی، نسلی تطہیر، کسی بھی ایسی پالیسی جو قومی تنازعے کا باعث ہو یا نسلی اقلیتوں پر جبر کرتی ہو کے خلاف ہے اور جمہوریہ روس کی سرکاری مشینری کی وفادار ہے۔ اس کے پروگرام میں مذہبی تعلیم، تجارت، ثقافتی روایات کی تجدید اور مسلم طلبہ کے لئے مالی وسائل کی فراہمی پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ ”نور“ کے دستور العمل میں ایک دفعہ علاقائی اور قومی تنازعے کے تصفیے کی خاطر عسکری قوت کے استعمال سے متعلق ہے۔ (۲۴) اس دفعہ کی روشنی میں ہی ”نور“ نے چیچنیا میں روسی افواج کی مداخلت کے خلاف احتجاج کیا۔ (۲۵) ”نور“ اس خیال کی بھی حامی ہے کہ گھنی آبادی والے مسلم علاقوں میں فوجی بھرتی سے قبل منظم طریقے سے تربیت دی جائے۔ یہ اس بات کی بھی حمایت کرتی ہے کہ روسی فوج میں خاص طور پر مسلم فوجی یونٹوں کا قیام صرف مسلم اہل کاروں کی مدد سے کیا جائے تاکہ مسلم فوجیوں کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا موقع مل سکے۔ (۲۶) ”نور“ کو دوسری تنظیموں پر قدرے فوقیت حاصل ہے کیوں کہ اسے قومی جمہوریاؤں میں نسلی بنیاد پر قائم پارٹیوں اور قومی تحریکوں کی ہمدردی حاصل ہے۔ قومی پارٹیوں کے نزدیک مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اس سے لوگوں کو متحد کرنے میں بہت مدد ملتی ہے اور باہمی اخوت و بھائی چارے کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ڈیوما کے انتخابات کے موقع پر ”نور“ نے روس کے مختلف اضلاع سے تقریباً سو امیدواروں کے نام کی تجویز رکھی۔ تحریک تاتارستان کے دو فعال ارکان حیدر کلیم (Ayder Khalim) جو ادیب ہیں اور گلوکار وافر گیزاتولینا (Vafire Gizatullina) بھی ڈیوما کے لئے ”نور“ پارٹی کے امیدواروں میں شامل تھے۔ (۲۷) اگرچہ تاتار نیشنلسٹ پارٹی ’اتفاق‘ نے ڈیوما کے انتخابات کا بائیکاٹ اس بنیاد پر کیا کہ ”جابر حکومت کی اعلیٰ ترین مجلس قانون ساز نے تاتار لوگوں کی زندگی بہتر بنانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔“ اور تاتار لوگوں سے انتخابات میں حصہ نہ لینے کی اپیل کی، لیکن جو لوگ مصائب جھیلنے کے لئے آمادہ تھے انہیں

'اتفاق' نے "نور" کی حمایت کی صلاح دی۔ (۲۸) اخبار 'آلتن اردا' (Altin Urda) کے ساتھ ایک انٹرویو میں گلوکاروافر گیزاتولیا نے کہا کہ کچھ قوم پرست ہمیں آزادیٔ تاتارستان کے تصور کا مخالف سمجھتے ہیں۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں:

> "ہمارے لئے تاتارستان کی آزادی ہمیشہ بنیادی نصب العین رہا ہے، لیکن موجودہ حالات میں یہ تقریباً ناممکن ہے، اس لئے ہم نے Federal power echelons سے تاتار لوگوں کی فلاح و بہبود کی خاطر جدو جہد کا فیصلہ کیا ہے۔" (۲۹)

وقتی طور پر آزاد ریاستوں کی فوجی تحریکیں روسی مسلمانوں کی جماعتوں کے عزائم اور مسلمانوں کی ثقافتی اور روحانی احیاء کی کوششوں کی پذیرائی کر رہی ہیں، لیکن یہ رجحان ایک خاص وقت تک ہی جاری رہ سکتا ہے۔ اگرچہ لوگوں کی روحانی بیداری میں اسلام نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے، لیکن کسی سنجیدہ سیاسی نصب العین کے حصول میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ قبائلی پارٹیاں اور آل رشن مسلم موومنٹ بنیادی سیاسی نظریے کے معاملے پر باہم ٹکرا سکتے ہیں۔ یہ دونوں پارٹیاں روسی حکومت کو ہی مکمل طور پر مسلمانوں کے قانونی اور سیاسی حقوق کا ضمانت دار مانتی ہیں، جب کہ قوم پرست پارٹیاں روس سے مکمل آزادی کے لئے کوشاں ہیں۔

کچھ ہی عرصہ پہلے، مئی ۱۹۹۶ء میں، یونین آف مسلمز آف رشا اور "نور" پارٹی نے ایک متحدہ تنظیم کی شکل میں یکجا ہونے کا فیصلہ کیا ہے جو "یونین آف مسلمز آف رشا (Union of Muslims of Russia) کے نام سے جانی جائے گی۔ الحاق کے سمجھوتے پر داغستان کے پایۂ تخت Makhachkala میں دستخط ہوئے۔ (۳۱) اس سے دو ہفتہ قبل شہر سارتوف (Sartov) کی جامع مسجد کے امام مکتداس بیباروف (Mukatdas Bibarsov) نے، جو ایک مقبول مذہبی رہنما اور "یونین آف مسلمز آف رشا" کے سابق جنرل سکریٹری ہیں، "مسلمز آف رشا" کے نام سے ایک نئی آزاد پارٹی تشکیل دی ہے۔ (۳۲)

یہ تمام حالیہ واقعات روس کے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی بالیدگی کو ظاہر کرتے ہیں، خاص طور سے یہ کہ وہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور پارلیمنٹ میں اپنی نمایندگی کے اہل ہیں، لیکن ان تمام کوششوں کے پس پردہ ایک اہم سوال چھپا ہوا ہے کہ ان سیاسی تنظیموں کے پاس

مسلم ووٹروں کو متاثر کرنے کی کتنی اہلیت ہے؟

(یہ مضمون انگریزی جریدہ یوریشین اسٹڈیز (ترکی) جلد ۳، شمارہ ۲، موسم گرما ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس عرصے میں روس کی مسلم سیاست میں ایسی کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی ہے جس سے یہ مضمون غیر ازوقت قرار پائے۔ مضمون کی اشاعت کا یہی جواز بھی ہے)

حوالہ جات

1. A. Bennigsen. *Islam in the Soviet Union- General Representation,* Ankara, Middle East Technical University Publications, 1985,p.1
2. D. M. Ishakov Neformainlye Obledinenlya v Sovremennom Tasteskom Obshchesive, Informal Grouping in Contemporary Society, (Vol.1) Kazan, 1990, cited in Malashenko. A, 'Islam Returns to the Russian Political Stage', Translation,29 December 1995, p.38
3. Ibid
4. A. Malashenko, "Tret Storonnikow Yeltsina-Musulmane". *Nezavisimaya Gazeta,s* (Moscow) no.103 (1182), 6June, 1996
5. S. Ryzhenkov and A. Filippov, "Russian Muslims and the Threat from the South," *DailyReview* (Moscow) 10 February 1995
6. Soyuz Musulman Rossii, *Kaledar Muslumanskikh Prazdnikov*(n.p, Moscow, n.d.,1995) p.3
7. *Programma Obshcherossiyskovo Obshchestvenno- Politicheskogo Divijeniya* "Soyuz Musulman Rossii", (n.p., Moscow, n.d., 1995, Political Program of the all Russian Muslim Political Movement, the Union of Muslims of Russia, p.13
8. Ibid.
9. Ibid
10. Mayak radio, "Union of Muslims Gives Yeltsin Conditional

Support". *SWB* 15 March 1996.

11. Ibid.

12. The Program Documents of the Muslims Political Parties 1917-1920, Resolution of Zakir Kadirov, Society for Central Asian Studies, (Oxford, 1985) pp.25-28

13. Ibid.

14. Ibid.

15. Soyuz Musulman Rossii, Kalendar Musulmanskikh Prazdnikov, (n.p. Moscow, n.d. 1995) p.4

16. Anna Pavetskaya, "Muslims To Support Yeltsin for Re-Election" Ekspress Khronika, *OMRI Daily Digest,* 15 March 1996.

17. "Russian Muslim Leader Resigns", *OMRI Daily Digest,* 20 February 1996

18. Monthly Informative Bulletin of the Union of Muslims of Russia, *Informatsionnoye Soobsheniye Rukovodstva Soyuza Musulman Rosii,* March11, 1996, p.2

19. *Politicheskaya Programma Obshcherossiyskogo Musulmanskogo Obshchestvennogo Dvijeniya*"Nur", (n.p. Moscow, n.d. 1995) Political Program of the all Russian Muslim Socio-Political Movement "Nur," p.1

20. Ibid

21. A. Malashenko "Tret Storonnikou Yeltsina Musulmane" *Nezavisimaya Gazeta,* (Moscow) no. 103, (1182) 6 June, 1996.

۲۲۔ حیرت ناک بات یہ ہے کہ "نورپارٹی" کے بانی احمد یاخن (Akhmet Yakhin) اسی زمانے میں جیرنووسکی (Jirinovskiy) کی لبرل ڈیموکریٹک پارٹی آف رشا کے نائب کے معاون تھے۔ دونوں پارٹیوں "دی یونین آف مسلمز آف رشا" اور "نورپارٹی" کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آیا جو جیرنووسکی کی انتہاپسند دائیں بازو کی پارٹی سے بڑی گہری وابستگی رکھتے تھے۔ یونین آف مسلمز آف رشا کے سابق جنرل سکریٹری احمد خالیتوف (Akhmet Khalitov) جیرنووسکی کی لبرل ڈیموکریٹک پارٹی آف رشا کے ایک سرکردہ رہنما تھے۔

23. Vafire Gizatullina, "Nur Podvodit Perviye Itogi" , *Altin Urda,* no.6 (76) February, (Kazan,1996)

24. *Politicheskaya Programma Obshcherossiyskogo Musulmanskogo Obshchestvennogo Dvijeniya"Nur"*, (n.p. Moscow, n.d. 1995) Political Prgram of the all Russian Muslim Socio-Political Movement Nur, p.2
25. Vafire Gizatullina, "Nur Podvodit Perviye Itogi" , *Altin Urda,* no.6 (76) February, (Kazan, 1996)
26. *Politicheskaya Programma Obshcherossiyskogo Musulmanskogo Obshchestvennogo Dvijeniya"Nur"*, (n.p. Moscow, n.d. 1995) Political Prgram of the all Russian Muslim Socio-Political Movement Nur, p.2
27. Rafail Heplehitov, "Minem Janim Biekte Kala" *Altin Urda,* no32 (66), November, (Kazan, 1995)
28. "V Kaazanskom Otdelenii Partii" *Altin Urda,* no. 32 (66) November. (Kazan, 1995)
29. Rafail Heplehitov, "Minem Janim Biekte Kala" *Altin Urda,* no32 (66) , November, (Kazan, 1995)

۳۰۔ اتفاق پارٹی کے لیڈر فوزی بیراموف (Fevziye Bayramova) سے انٹرویو۔

31. "Rusya Musulmanlan Birlesti" Turkiya. 2 May 1996

۳۲۔ اتفاق پارٹی کے لیڈر فوزی بیراموف (Fevziya Bayramova) سے انٹرویو۔

عبد العلی

ترجمہ: صلاح الدین
محمد اسلم عمری

نفسیاتی علاج اور مسلم اطباء

جدید سائنسی علوم کی ترقی کے باعث اب یہ بات مدلل اور واضح طور سے کہی جا سکتی ہے کہ نفسیاتی عوامل (تناؤ، اضطراب اور ضرورت سے زیادہ ہوس پرستی) انسانی صحت پر مضر اثرات ڈالتے ہیں اور آنتوں کا عارضہ، اعصابی انتشار، جلدی بیماریوں اور بہت سے دیگر امراض کا سبب بنتے ہیں جن کا تعلق خون اور نظام تنفس سے ہوتا ہے۔

زمانۂ قدیم میں نفسیاتی عارضے ان مریضوں سے خاص مانے جاتے تھے جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بدروحوں یا شیاطین کے زیر اثر ہیں۔ یہی نظریہ یورپ میں قرون وسطی میں رائج رہا جو اہل یورپ کے لئے دور تاریک تھا۔ لہٰذا ان بیماریوں میں مبتلا مریضوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا اور بری طرح پیٹا جاتا تھا۔ ایک عجیب طریقہ یہ بھی تھا کہ تکلیف میں مبتلا جسم سے شیطان کو خارج کرنے کے لئے اور اسے راستہ بہم پہنچانے کی غرض سے مصیبت زدہ انسان کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا جاتا تھا۔ زمانۂ ماقبل تاریخ کی ایسی سوراخ کی ہوئی کھوپڑیاں برطانیہ، فرانس اور یورپ کے دیگر حصوں میں پائی گئی ہیں (۱) کچھ ایسی بھی مثالیں ہیں جہاں اس مفروضے پر مریض کو جلا دیا گیا کہ اس کے جسم میں بدروحوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ علاوہ ازیں وبائی بیماریوں کے پھوٹ پڑنے کو خدائی سزا تصور کیا جاتا تھا، ۱۴ویں صدی عیسوی تک عیسائی ممالک میں یہ پختہ عقیدہ رائج تھا کہ کالی موت (یہ طاعون کی ایک قسم ہے جسے بیونی پلیگ کہتے ہیں۔ اس میں جسم پر کالے دھبے پڑ جاتے ہیں یورپ میں یہ بیماری وبائی

شکل میں پہلی دفعہ ۱۴ویں صدی عیسوی میں پہنچی۔ مترجمین) خدا کا عذاب ہے۔

نفسیاتی امراض کی تشخیص اور علاج میں کامیابی حاصل کرنے کا اعزاز یونانی اطباء کو جاتا ہے جنہوں نے طب بالخصوص مالیخولیا جیسے نفسیاتی امراض میں نمایاں ترقی حاصل کی۔ بقراط (۴۰۰ق م میں بام عروج پر تھا) پہلا یونانی طبیب تھا جس نے جسم کے نفسیاتی انتشار کو آسیب زدہ ہونے کے بجائے فطری وجوہات کی طرف منسوب کیا۔ (۲) وہ بجا طور پر بابائے طب کے لقب سے سرفراز ہوا۔ اس نے بیماریوں کے خدائی مبداء کے نظریے کو رد کیا اور علم طب میں مشاہدہ اور توضیحی عمل کی ابتدا کی۔ بہر کیف اس کا عظیم کارنامہ اخلاقیات طب کا وہ منشور ہے جو حلف بقراط (Hippocratic Oath) کے نام سے مشہور ہے اور دو ہزار سال سے زیادہ تر عرصے طبی پیشے کو رہنمائی عطا کرتا رہا ہے۔ (۳)

مسلم اطباء نے طب کی ہر شاخ بشمول نفسیاتی علاج میں زبردست ترقی کی اور طب کی تعلیم و تعلم میں بھرپور تعاون دیا۔ طب، دواسازی اور جراحت میں ان کے کارہائے نمایاں کو کچھ مورخین طب نے پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ لیکن نفسیاتی علاج کے میدان میں ان کی خدمات سے چند تعلیم یافتہ لوگ ہی واقف ہیں۔

نفسیاتی علاج میں قرآن کے اثرات

علم طب کے میدان میں بھی قرآن مجید نے مسلمانوں کو متحرک کرنے میں کافی موثر رول ادا کیا۔ کتاب اللہ میں انسانوں کو سائنسی اور تجربی خطوط پر تربیت یافتہ کرنے، غور و تدبر، مراقبہ اور قوت متخیلہ کے ذریعے اس کے عمومی ذہنی اور جسمانی صحت کی اصلاح کے لئے بہت سی ہدایات دی گئی ہیں۔ (۴)

اصطلاح شرک کی معنویت اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے جتنا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ اس کے وسیع تناظر میں خالق کائنات کے علاوہ کسی شخص یا چیز کو بزرگی (حمد و ثنا) اور ستائش کا مستحق سمجھنا تقریباً مصدقہ بت پرستی کی ایک شکل ہے۔ قرآن مجید میں اس عمل کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ شرک انسانوں کو قوت حیات اور خود اعتمادی کو کمزور کرتا ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ سب ہی اچھی چیزوں کے لئے تمام

حمد و ثنا(۵) نیز افتخار(۶) بلاشرکت غیرے خالق کائنات کے لئے ہی زیب دیتا ہے۔ نکات بالا کی واضح طور پر تصدیق ذیل کی آیات سے ہوتی ہے۔

یعلم خائنة الاعین وماتخفی الصدور(۷)

(وہ آنکھوں کی خیانت کو اور سینوں کی پوشیدہ باتوں کو (خوب) جانتا ہے۔)

لایعزب عنه مثقال ذرة فی السمٰوات ولا فی الارض ولا اصغر من ذلک ولا اکبر الا فی کتاب مبین لیجزی الذین آمنوا و عملوا الصالحات اولٰک لهم مغفرة ورزق کریم والذین سعو ا فی آیاتنا معاجزین اولئک لهم عذاب الیم.(۸)

(اللہ تعالیٰ سے ایک ذرہ کے برابر کی چیز بھی پوشیدہ نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس سے بھی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے۔ تاکہ وہ ایمان والوں اور نیکوکاروں کو بھلا بدلہ عطا فرمائے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔ اور ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کی جنہوں نے کوشش کی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔)

واذا حیّتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها ان الله کان علی کل شئ حسیبا.(۹)

(جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔)

و ان الشیاطین لیوحون الی اولیاء هم لیجادلوکم.(۱۰)

(اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کے دل میں ڈالتے ہیں۔)

یہاں شیاطین (برے لوگ) کی اصطلاح کا استعمال ان برائیوں کو مجسم کرنے کے لئے کیا گیا ہے جن کی بنیادی وجوہ جہالت، جھوٹی شان اور حسد وغیرہ ہیں۔ قرآن مجید میں جن اور انس دونوں کو ان بیماریوں کو پھیلانے کے لئے بطور تشبیہ برے لوگ کہا گیا ہے۔

قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا مقصد انسان کی مندرجہ بالا اور اس جیسی دوسری روحانی

بیماریوں کی وجوہات کی اصلاح کرنا ہے۔ نیز اس زندگی میں تخلیق کائنات کی ساخت اور غرض وغایت سے واقف کراتے ہوئے آخرت کے جہان روشن میں داخل کرتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

ومن کان فی ھذہ اعمی فھو فی الآخرۃ اعمی و اضلّ سبیلا۔ (۱۱)

(اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا اور راستے سے بہت ہی بھٹکا ہوا رہے گا۔)

یہاں لفظ "اندھا" انسان کے باطن کے اندھے پن کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ (۱۲)

قرآن مجید کے مطابق خالق ہمیشہ حسن وجمال کی حالت میں رہتا ہے کیوں کہ وہ ہمہ وقت مکمل قانون اور سراپا انصاف ہے۔ لفظ مذہب، انصاف، قانون اور مشیت تقریباً ایک دوسرے کے مترادف ہیں نیز توضیحی طور پر اسی خالق حقیقی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ وہی تنہا بلاشرکت غیرے جزاوسزا کا مختار کل ہے۔ یہ بات ذیل کی آیات سے بخوبی واضح ہوتی ہے:

شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملائکۃ و اولوا العلم قائما بالقسط لا الہ الا ھو العزیز الحکیم۔ (۱۳)

(اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔)

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون۔ (۱۴)

(پس آپ یکسو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بدلتا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں

سمجھتے۔)

قل ادعوا الله او ادعوالرحمن ایاما تدعوا فله الاسماء الحسنیٰ ولاتجهر بصلاتک ولا تخافت بها و ابتغ بین ذلک سبیلا۔(۱۵)

(کہہ دیجئے اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو تمام اچھے نام اسی کے ہیں نہ تو تو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھ اور نہ بالکل پوشیدہ بلکہ اس کے درمیان کا راستہ تلاش کر لے۔)

علاوہ ازیں قرآن مجید یہ بھی سبق دیتا ہے کہ انسان قانون دہندہ (اللہ) کی فطرت پر بنا ہے اور وہ اس کا نائب ہے۔ انسان دوسری مخلوقات کی بہ نسبت سب سے خوب صورت اور تخلیق کا شاہکار ہے۔ باقی مخلوقات بشمول فرشتے انسان سے درجے اور رتبہ میں کم تر ہیں، زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کے تابع کر دی گئی ہیں۔

انسان کو نہ صرف اپنی اصلاح کرنے اور اپنی تقدیر سنوارنے کا اختیار حاصل ہے بلکہ خالق کے ذریعے عطا کی گئی رہنمائی کی مدد سے وہ اپنے قول و فعل سے دنیا میں قدرت پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے جب کہ باقی مخلوقات اس بات کی مکلف ہیں کہ وہ انسان کے اعمال کے مطابق اس کے لئے نفع بخش یا نقصان دہ ثابت ہوں۔ یعنی انسان کے تخلیقی (درست اور نیک) کام میں اس کی معاون ہوں اور اس کے تخریبی (غیر درست اور برے) کام میں اس کے لئے مضر ثابت ہوں۔

بالفاظ دیگر اگر آدمی قادر مطلق کے مقصد تخلیق کے تئیں منصف، صادق، تعمیری طور پر جفاکش، ضبط نفس کا پابند اور مخلصانہ طور پر اللہ کا وفادار ہو تو نہ صرف وہ اپنی جسمانی اور دماغی صحت کی اصلاح کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ ایک طاقتور عنصر بھی بن جاتا ہے۔ وہ عالم گیر ماحولیاتی نظام پر اس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے کہ اس کو قدرت سے معلوم اور نامعلوم نعمتیں برابر ملتی رہیں حتیٰ کہ وہ موجودہ زندہ انواع کی جگہ اس سے زیادہ خوبصورت اور ہمیشہ رو بہ ترقی انواع کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔ اس نکتے کی تصدیق قرآن مجید کی بہت سی آیات سے ہوتی

ہے۔ مندرجہ ذیل آیتیں بطور نمونہ پیش کی جارہی ہیں۔

فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره ومن یعمل مثقفال ذرة شرا یره۔(۱۶)

(پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔)

و ان لیس للانسان الا ماسعی و ان سعیه سوف یری۔(۱۷)

(اور یہ کہ ہر انسان کے لئے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی اور یہ کہ بیشک اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔)

ظهر الفساد فی البر والبحر بماکسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون۔(۱۸)

(خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا اس لئے کہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھادے (بہت) ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں۔)

و لو ان اهل القریٰ آمنوا و اتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا فاخذناهم بماکانو یکسبون۔(۱۹)

(اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔)

مایفعل الله بعذابکم ان شکرتم و آمنتم وکان الله شاکرا علیماً۔(۲۰)

(اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور باایمان ہو۔)

ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا فلاخوف علیهم ولا هم یحزنون۔(۲۱)

(بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جمے رہے تو ان پر نہ تو کوئی

خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔)

قادر مطلق نے قرآن مجید کے ایک وصف کی مناسبت سے اس کا نام الحکیم (عاقل، شافی) رکھا ہے اس کی دلیل ذیل کی آیات ہیں جو قرآن مجید کے شفا بخش ہونے کے پہلو کو روشن پیرائے میں بیان کرتی ہیں۔

وننزل من القرآن ما هو شفاء للمؤمنين و رحمة ولايزيد الظالمين الا خسارا۔(۲۲)

(یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لئے تو سراسر شفا اور رحمت ہے ہاں ظالموں کو بجز نقصان کے اور کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی، صحت واصلاح سے متعلق تعلیمات، کافی مشہور ہیں جس کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ذیل میں طبی افادیت کی حامل دو روایات کا تذکرہ کافی ہوگا۔

۱۔ اے خدا کے بندو! اپنی بیماریوں کا علاج کرو، دنیا میں کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا علاج نہ ہو، سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔

۲۔ وقتاً فوقتاً دلوں کو خوش رکھو ورنہ وہ زنگ آلود ہو جائیں گے جیسے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

معروف مسلم معالجین نفسیات

طب کے میدان میں مسلم اطباء کو سب سے زیادہ تحریک قرآن مجید اور سنت کی تعلیم سے ملی۔ ان میں سے کچھ نے نفسیاتی علاج میں مہارت حاصل کی اور اس فن کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ ذیل میں نفسیاتی علاج کے طریقہ کار کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

علی بن سہل طبری (متوفی ۸۶۱)

طب کی قدیم عربی کتاب فردوس الحکمۃ کا مصنف اور طبیب تھا۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ ہندستانی دوروں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا اصل ماخذ سنسکرت ہے۔

اس کتاب میں نفسیاتی بیماریوں کو دماغی امراض میں شمار کیا گیا ہے۔ سر درد، تنہائی، نسیان، فریب نظر، مایوسی اور افسردگی اس کی مخصوص علامات ہے۔ جیسا کہ اس نے لکھا ہے کہ کچھ مریض فضا میں تیز شور سنتے ہیں جب کہ بعض دوسرے خود کو حیوان تصور کرتے ہیں اور انسان کو دیکھ کر بھاگتے ہیں۔ انہوں نے ان تمام علامات کا سبب دماغی انتشار قرار دیا ہے۔ یہ امراض نفسیاتی عوامل (غم، غصہ اور عشق وغیرہ) کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ ان بیماریوں کا علاج مریض میں غصہ اور غیر محفوظ ہونے کی وجوہات کو دور کر کے نیز اس کے میلان طبع کے مطابق خوش گوار گفتگو سے کیا جا سکتا ہے۔

اسحاق بن عمران (متوفی ۹۰۸ء)

نفسیاتی امراض کے نمایاں مسلم معالجین میں شامل تھا۔ وہ پہلا مسلمان مصنف تھا جس نے مرض مالیخولیا پر مستقل ایک کتاب لکھی۔ اس نے غم، تنہائی، مایوسی اور افسردگی کا خاص علامات کے طور پر ذکر کیا ہے۔

اس طبیب نے نفسیات امراض کے بعض خاص حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک بار کسی مریض کو یہ گمان ہو گیا کہ اس کے شانوں پر سر ہی نہیں ہے جب کہ ایک دوسرے مریض نے صرف اس مفروضے پر کہ آسمان اس کے اوپر گر پڑے گا گھر سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا۔ اس قسم کے بیش تر مریض نیند نہ آنے اور سر درد کی شکایت کرتے ہیں۔ کچھ مریضوں کی آنکھیں بہت نمایاں طور پر چمک دار ہوتی ہیں۔ اس نے تفصیل سے ان نفسیاتی وجوہات کا ذکر کیا ہے جو مردوں اور عورتوں کو شدید اور مسلسل جذباتی دھچکا لگنے کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں۔ اس نے عورتوں میں نسیان کی وجہ کثرت استقرار حمل کو بھی قرار دیا ہے۔ اس لئے ان مریضوں کا علاج دواؤں کے ذریعہ کرنے کے پہلو بہ پہلو نفسیاتی علاج کے طریقے جیسے خوش گوار گفتگو، موسیقی، نرم مزاجی، پر لطف مناظر کی سیر نیز مسکّن تیل سے جسم کی مالش کے بعد غسل استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے صاف طور پر کہا ہے کہ مالیخولیا اکتسابی اور موروثی دونوں طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

ابن زکریا رازی (متوفی ۹۳۲ء)

اس کی مشہور طبی دائرۃ المعارف الحاوی میں بے شمار نفسیاتی امراض کے حوالے موجود ہیں۔ اس نے نفسیاتی علاج پر ایک کتاب الطب الروحانی بھی تحریر کی ہے۔ اس کتاب میں اس نے نفسیاتی علاج کے طریقہ کار اور دائرے کے ساتھ ساتھ نفس اور جسم کے درمیان قریبی تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عمومی اصول صحت کی تشریح کی ہے۔ (۲۳) اس نے مغالطہ، خام خیال آرائی اور عشق کے انسانی صحت پر پڑنے والے مضر اثرات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ جسم میں بد ہضمی سے پہلے نفسیاتی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اس طبیب کے مطابق نفسیاتی اسباب کا صحت کو باقاعدہ بنانے میں ہمیشہ بہت دخل ہوتا ہے کیوں کہ جسم کی خصوصیات ان اسباب کے زیر اثر رہتی ہیں جو دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم المعالجات میں نفسیاتی پہلو کی اہمیت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس دلیل کی بنیاد پر اس کو یقین تھا کہ صرف لائق ماہر نفسیات ہی کامیاب طبیب بن سکتا ہے۔ اس کا مرتب کردہ ضابطۂ اخلاق معالج سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ علاج کے نتائج کچھ بھی ہوں وہ ہمیشہ مریض کو صحت مند ہو جانے کی امید دلاتا رہے۔ طب کی اس شاخ میں اس کی فضیلت کے اعتراف میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ اس نے امیر منصور بن نوح سامانی کو نفسیاتی علاج کے ذریعہ صحت مند کر دیا اس کے باوجود کہ اس کا جسم مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔

ابن سینا (متوفی ۱۰۳۸ء)

ابن سینا نے نفسیاتی علاج کی ترقی میں غیر معمولی حصہ لیا۔ اس کی طبی دائرۃ المعارف القانون نہ صرف مسلم دنیا بلکہ عیسائی یورپ میں بھی تقریباً چھ صدیوں تک طب کی اعلیٰ و مستند تصنیف مانی جاتی رہی۔ اس کتاب میں اس نے بہت سے اعصابی اور نفسیاتی امراض سے بحث کی ہے۔ چوں کہ وہ امراض کے نفسیاتی عوامل سے کلی طور پر واقف تھا اس لئے اس کے طریقۂ علاج میں جسمانی امراض کے نسخہ جات کے ساتھ ہی عموماً اخلاقی اور روحانی اصلاح کی ترغیب بھی شامل ہوتی تھی۔

ابن سینا نے پوری وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ انسان کی جسمانی صحت کا تعلق اس کے موروثی اور اکتسابی نفسیاتی حالات سے بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ پستان سے دودھ پلانے والی ماؤں کے بہت سے فطری میلانات طبع ان کے بچوں میں نفوذ کر جاتے ہیں۔ اس لئے اس نے دودھ پلانے والی ماؤں کو مشورہ دیا ہے کہ انہیں اپنی اخلاقی حس کو اعلیٰ سطح پر رکھنا چاہیئے، جہاں تک ممکن ہو وہ غصہ، خوف، غم اور بزدلی سے پیدا ہونے والے منفی جذبات سے متاثر نہ ہوں۔ اس نے ایسی دوائیں بھی تیار کی تھیں جو مالیخولیا، ہائپر ٹنشن اور اختلاج قلب کے لئے نہایت مفید تھیں۔ اسی طرح اس نے بعض ایسی دوائیں بھی تیار کیں اور تجویز کیں جو دل کو افسردگی سے محفوظ رکھنے والی اور طاقت دینے والی تھیں۔ اس نے عشق کو نفسیاتی مرض قرار دیا۔ اس بیماری سے متاثرہ جسم کی طبیعی کیفیات کے بارے میں اس کی کتاب القانون میں پوری ایک فصل موجود ہے۔

ابن سینا نے مریضوں کے علاج میں انسانی نفسیات کے اپنے عمیق علم کا پوری طرح استعمال کیا۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان عورت جو ہاتھ کے فالج میں مبتلا تھی اس کے پاس علاج کے لئے لائی گئی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ سابقہ علاج سے اس کو کچھ فائدہ نہ ہوا تو اس نے ایک نفسیاتی تدبیر بروئے کار لاتے ہوئے اس لڑکی کو سب کے سامنے کھڑے ہونے کو کہا اور اس کا پردہ اچانک کھینچ کر اسے شدید طور پر شرمندہ کر دیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے لباس کو سر سے اوپر اٹھالیا۔ نوجوان عورت نے جبلی طور پر اپنے ہاتھوں کو لباس کے اندر کرنے کے لئے اوپر اٹھالیا اور وہ صحت یاب ہو گئی۔

بنو بویہ سے متعلق ایک شہزادی اس خام خیالی کے عارضے میں مبتلا تھی کہ وہ گائے ہے۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے بہت لاغر ہو گئی۔ وہ اس بات کی بھی ضد کرتی تھی کہ اسے ذبح کر دیا جائے تاکہ لوگ اس کا گوشت استعمال کر سکیں۔ جب وہ ابن سینا کے پاس لائی گئی تو اس نے شہزادی کا نفسیاتی علاج کیا۔ اس نے اپنے ایک معاون سے کہا وہ یہ اعلان کرے کہ قصاب آرہا ہے۔ اس کے بعد لڑکی کو زمین پر لٹا دیا گیا۔ جب قصاب کی شکل میں طبیب اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ اتنی لاغر گائے کو ذبح کرنا بے جا ہوگا۔ ذبح ہونے سے پہلے اسے فربہ

ہونا چاہئے۔ اس پر مریض کا رد عمل مثبت ہوا اور اس نے غذا اور دوا لینا شروع کر دیا۔ تندرست ہونے کے نتیجے میں وہ دماغی طور پر بھی مکمل صحت یاب ہو گئی۔

ابن الجزار بن ابراہیم (متوفی ۱۰۰۵ء)

یہ بھی ایک مشہور پیشہ ور طبیب اور مصنف تھا۔ جدید تیونس کے شہر قیروان میں وہ بام عروج پر پہنچا۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں اپنے نفسیاتی علاج کے وسیع علم کو عام کیا۔ لاطینی زبان میں جب ان کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یورپ کے طبی حلقوں میں اس کو کافی شہرت ملی۔ اس کی طبع زاد تصانیف میں ایک کا عنوان سیاسة الصبیان وتدبیرھم تھا۔ یہ کتاب استقرار حمل سے لے کر عنفوان شباب تک بچوں کی پرورش اور خوش انتظامی کے امور سے متعلق ہے۔ اس میں ماؤں اور دائیوں کے لئے صحت کے بے شمار رہنما اصول بیان کئے گئے ہیں۔ (۲۴)

مصنف کی دوسری اہم کتابیں طب المشائخ وحفظ صحتھم (ضعیفوں کا علاج اور حفظان صحت) مداوة النسیان وطرق تقویة الذاکرہ (علاج نسیان اور قوت حافظہ کو بڑھانے کے طریقے) اور المعدة وامراضھا و مداواتھا (پیٹ کی بیماریاں اور ان کا علاج) تھیں۔

ابن البطلان المختار بن عبدون (متوفی ۱۰۶۸ء)

اس کی کتاب تقویم الصحة صحت کی بحالی اور اس کی حفاظت کے طریقوں سے متعلق ہے۔ لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ اس کے نتیجے میں مصنف کو مغرب کے طبی حلقوں میں کافی عزت ملی۔ اس کتاب میں مصنف نے نفسیاتی عوامل کو ان چھ وجوہات (مثلاً صاف ہوا، کھانا اور پینا، راحت اور کام، بیداری اور نیند، فاسد مادہ کا اخراج اور جذباتی حالت اور رد عمل) میں سے ایک اہم وجہ شمار کیا ہے جو انسانی صحت کو متاثر کرتی ہیں۔ اس کی رائے ہے کہ اگر ان چھ عوامل میں توازن قائم رہے تو جسم صحت مند رہتا ہے اور توازن بگڑ جانے سے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی سفارش کرتا ہے کہ صحت یابی کی رفتار تیز

کرنے کے لئے پر کیف موسیقی کی مدد سے مریض کا حوصلہ بڑھانا چاہیئے۔

مندرجہ بالا ماہرین کے علاوہ بھی بے شمار اطباء تھے جن کو طب کی اس شاخ میں شہرت حاصل ہوئی۔ یہاں ان سب کے کارناموں کا تفصیل سے ذکر کرنا ممکن نہیں ہے، پھر بھی ان میں سے کچھ کا ضمنی حوالہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

علی بن رضوان (متوفی ۱۰۶۷ء) الکفایۃ فی الطب کا مصنف تھا۔ جس میں اس نے اس امر کی توضیح کی ہے کہ دل کی دھڑکن کا دماغ کے نفسیاتی عوامل سے بہت گہرا تعلق ہے۔

ہبۃ اللہ ابوالبرکات اپنے وقت کا مشہور معالج نفسیات تھا۔ اس کو ۱۲ویں صدی عیسوی کے بغداد میں عروج حاصل ہوا۔

عبدالملک زہیر (متوفی ۱۱۶۲ء) مسلم اسپین کا مشہور طبیب تھا جس نے بہت سی نفسیاتی بیماریوں کا ذکر اپنی طبی تصانیف میں کیا ہے۔

داؤد بن عمر انطاکی (متوفی ۱۶۰۰ء) کا شمار ما قبل جدید دور کے مشہور مسلم معالجین نفسیات میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں مالیخولیا کی ان تمام اقسام کا ذکر کیا ہے جو اس کے دور میں عام تھیں۔

مسلم اسپتالوں میں نفسیاتی علاج کی صورت حال

عالم اسلام کے ہر بڑے شہر میں نہ صرف جسمانی امراض میں مبتلا مریضوں کی تیمارداری اور علاج کا معقول انتظام تھا بلکہ مخبوط الحواس اور ضعیف العمر انسانوں کے لئے بھی اسپتالوں کا انتظام تھا۔ ان اسپتالوں کو قائم کرنے کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے اسپتالوں میں مریضوں کی تیمارداری کے اعلیٰ فن کو ترقی دی۔ خلفاء اور حکمراں ان کے انتظام پر خاص توجہ دیتے تھے۔ باقاعدہ معائنہ بھی کرتے اور ذاتی طور پر معاملات کی نوعیت پر بھی نگاہ رکھتے تھے نیز مریضوں کے حالات بھی دریافت کرتے رہتے تھے۔ مصر کا ابن طولون اور منصوری اسپتال، بغداد کا عضدی اسپتال، دمشق کا نوری اسپتال اور مراکش کا موحدی اسپتال بہت مشہور تھے۔ (۲۵)

ان اسپتالوں کا انتظام جدید خطوط پر کیا گیا تھا اور نفسیاتی علاج کے مختلف طریقوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں گراں قدر کتب خانے بھی تھے جہاں مریضوں کو کتابیں بھی فراہم کی جاتی تھیں۔ مثلاً ابن طولون اسپتال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں مختلف مضامین کی ایک لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔ ان اسپتالوں میں نفسیاتی امراض میں مبتلا مریضوں کی تیمارداری پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ انہیں پیشہ ور موسیقار، قصہ گو اور قرآن مجید کے عمدہ قاری بہم پہنچائے جاتے تھے۔ جہاں موسیقار اور قصہ گو اپنی خوش گوار موسیقی اور پر لطف کہانیوں اور مزاحیہ قصوں سے مریضوں کا دل بہلاتے تھے، وہیں قرآن مجید کے قاری ان کی روحانی طاقت کو متحرک کر کے ان کی خود اعتمادی کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مریضوں کو کھلی جگہوں پر گھومنے پھرنے کی سہولت دی جاتی تھی، انہیں راحت بخش غسل بھی کرایا جاتا تھا اور تناؤ کی علامات سے چھٹکارا دلانے اور ان کی تکلیف میں کمی لانے کی غرض سے ہر صبح ان کے کپڑے بدلوائے جاتے تھے۔

(نوٹ :۔ یہ مقالہ انگریزی سہ ماہی مجلہ ہمدرد میڈیکس، کراچی، جلد ۳۳، شمارہ ۴/اکتوبر۔ دسمبر، ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا)

حوالہ جات

۱۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۱، ص ۸۲۳۔ پیرو میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ الجزائر کے وحشی قبائل میں آج بھی یہ عمل جاری ہے مگر اب تیزی سے معدوم ہوتا جارہا ہے۔ ان کھوپڑیوں میں زخم کے مندمل ہونے کے بھی آثار ملے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس عمل کے بعد انسان زندہ بچ جاتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ص ۷۷۵ (مترجمین)

۲۔ انتھونی ننگ، دی عربس، لندن، ص ۱۴۹

۳۔ ایضاً، جلد ۱۵، ص ۱۵۵

۴۔ عبدالعلی، کیر آف ہیلتھ ان اسلام، ہمدرد میڈیکس، پاکستان، جلد ۲۹، ص ۵۳۔ ۷۰

۵۔ قرآن مجید، سورہ فاتحہ، ترجمہ صلاح الدین یوسف

۶۔ الانعام: ۷۹

۷۔ المومن: ۱۹

۸۔ سبا: ۳۔ ۵

۹۔ النساء: ۸۶

۱۰۔ الانعام: ۱۲۱

۱۱۔ بنی اسرائیل: ۷۲

۱۲۔ الحج: ۴۶

۱۳۔ آل عمران: ۱۸

۱۴۔ الروم: ۳۰

۱۵۔ بنی اسرائیل: ۱۱۰

۱۶۔ زلزال: ۷۔ ۸

۱۷۔ النجم: ۳۹۔ ۴۰

۱۸۔ الروم: ۴۱

۱۹۔ الاحقاف: ۹۶

۲۰۔ النساء: ۱۴۷

۲۱۔ الاعراف: ۹۶

۲۲۔ بنی اسرائیل: ۸۲

۲۳۔ سمیع کے حمرنہ: دی جینیس آف عرب سویلائزیشن، ص ۱۷۰

۲۴۔ حوالہ سابق: ص ۱۷۷

۲۵۔ عبدالعلی: دی عرب ہاسپٹل سسٹم ان دی مڈل ایج، جرنل آف مسلم ورلڈ لیگ، مکہ، جلد ۹۔ ۱۰۔ ۱۲، ص ۲۷۔ ۲۹ جولائی، ۱۹۸۵ء

ہارون خاں شیروانی

ترجمہ: اختر الواسع

قرآنی ریاست

مسلمانوں کے سیاسی افکار کے وسیع و عریض موضوع کے مطالعہ کے دوران ہم ان سیدھی سادی سچائیوں سے دوچار ہوتے ہیں جن سے وہ عظیم دریا جاری ہوا جس نے سال بہ سال اور صدی بہ صدی فکر و خیال کے کہساروں، وادیوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے بے شمار شکلیں اختیار کیں، جو ملکوں کی جغرافیائی حدود کے مطابق ظاہری صورتیں بدلتا رہا لیکن اپنی ماہیت اور اصل کے اعتبار سے ہمیشہ یکساں رہا۔ اس موضوع پر ہم جتنا زیادہ غور کرتے ہیں اتنا ہی یہ احساس قوی تر ہوتا ہے کہ مسلم سیاسی دانشوروں سے متعلق کسی بھی بحث کا آغاز کرنے سے پہلے قرآن میں پیش کیے گئے اسلامی سیاسی تصور کے اصل الاصول کا تجزیہ کرنا لازمی ہے۔

کئی اسباب کی بنا پر یہ کام بے پناہ وسعت کا حامل ہے۔ اولاً قدیم عرب معاشرے اور قرآن جیسی کتاب کے سلسلہ میں خالص سیاسی تصورات کو ان تصورات سے جدا کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے جنہوں نے ایک زمانے میں قبائلی عربوں کو دنیا کی صف اول کی قوم بنا دیا تھا، کیوں کہ “سیاسی” اور “غیر سیاسی” عوامل کے درمیان جو لطیف فرق ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے بہت جدید ہے اور صدیوں قبل کے لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے۔ مزید برآں ہمیں یہ حقیقت بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ تنظیم اور نظم و ضبط جو انسانوں کے لئے ممکنہ آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہیں اور جنہیں عام اصطلاح میں سیاست کہا جاتا ہے کسی بھی معاشرے کی بہتری میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن اگر سیاست کو انسانی زندگی میں کارفرما دیگر عوامل سے علیحدہ کر کے دیکھیں تو ہم اس موضوع کے پورے پس منظر کا احاطہ نہیں کر پائیں گے اور نتیجتاً جو تصویر بنے گی وہ غیر حقیقی اور مسخ شدہ ہوگی۔

عہد ماقبل کے حوالے

موضوع کے پورے پس منظر کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے بہتر ہے اگر ہم چھٹی صدی عیسوی کے دوران جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر قائم ریاستوں کی سیاسی تنظیم اور عربوں کی سیاسی صورت حال کے بارے میں تھوڑا بہت واقف ہو لیں لیکن اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ مذکورہ ریاستوں کی سیاسی تنظیم کا قرآنی ریاست سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہے۔ اس وقت عرب کے شمال میں دو طاقتور سلطنتیں قائم تھیں:۔ ایک ایرانی اور دوسری بازنطینی۔

مغربی اور وسط ایشیا کی تہذیب ایران سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ بازنطینی سلطنت جسے مشرقی رومی سلطنت بھی کہا جاتا ہے قدیم یونان اور روم کی براہ راست وارث تھی۔ ان دونوں سلطنتوں اور عرب کی سیاسی تنظیم کا مطالعہ خاصہ دلچسپ ہے اگر ہم ان کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں اور عدم مماثلتوں کی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں جو بصورت دیگر بہت مشکل کام ہے۔

ایران ماقبل اسلام

اس زمانے میں ایران، یونان اور روم کی معلوم تاریخ کے آغاز سے سینکڑوں برس قبل تک کی مربوط تاریخ کا حامل تھا اور آغاز سے ہی اس نے ایسی زبردست وحدت اور مرکزیت کے شواہد پیش کیے ہیں جن کا حصول اس قدیم زمانے میں انتہائی مشکل تھا۔ ایرانی تہذیب کے افق پر زرتشت کے ظہور کے وقت ایران کی مذہبی صورت حال ابتر تھی۔ زرتشت نے ایرانی معاشرے کے اس اہم طبقے Magipets (ایک اندازے کے مطابق انہیں مع بچہ کہا جا سکتا ہے) کی اصلاح کا علم اٹھایا جسے مذہب کا امین اور اہورمزد (اس وقت کے ایرانیوں کا خدا) تک رسائی کا وسیلہ تصور کیا جاتا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں یا یوں کہیں کہ خسرو نوشیرواں کے زمانے کے آس پاس ایرانی معاشرہ واضح طور پر چار طبقوں میں منقسم تھا۔ ان کی اپنی اپنی جداگانہ شناخت تھی۔ اوپر کے تین طبقوں اور نچلی ذات کے لوگوں پر مشتمل چوتھے طبقے میں واضح فرق تھا۔ اعلی طبقے پجاریوں اور منصفوں پر مشتمل تھے۔ ان کا انتخاب صرف Magi قبیلے کے افراد میں

سے ہوتا تھا۔ اسی لئے انہیں Magipets or Mobeds کہا جاتا تھا یعنی فوجی اور افسران۔ چوتھا طبقہ دست کاروں (اہل حرفہ) اور کاشت کاروں پر مشتمل تھا۔ سیاسی وحدت اور تنظیم کی ظاہری علامت شہنشاہ تھا۔ وہ نہ صرف صوبائی گورنروں کا حاکم اعلیٰ تھا بلکہ ایسے حکمران بھی اس کے زیر اقتدار تھے جو سلطنت کے دور دراز علاقوں مثلاً فرات کی طرف حیرہ اور عرب کے جنوب مغرب میں یمن وغیرہ پر حکومت کرتے تھے۔ اعلیٰ ترین اشرافیہ میں مرزبانوں (Marzbans) اور پہلویوں (Pahlavis) کے طبقے تھے جن کا دعویٰ تھا کہ وہ آرساسانیوں (Arsacides) کی انجب اور اشرف ترین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایران سپاہ پد (Iran-spah-pad) یعنی سپہ سالار اور سپاہ پد (Spah-pad) یعنی سپہ سالار اسپ کے محتشم عہدوں پر فائز تھے۔ وہ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے جن سے حاصل ہونے والی مالی یافت بغیر ٹیکس کے براہ راست ان کی جیب خاص میں جاتی تھی۔ (۲) ان طبقوں کا تعلق پیدائشی اشرافیہ سے تھا۔ اشرافیۂ منصبی بھی کم سخت گیر نہیں تھا۔ اس کے برعکس نام نہاد ”عوام“ میں دیہی علاقوں کے آزاد لوگ اور غلام شامل تھے جو بغیر کسی اجرت یا صلہ کے کھیتوں یا فوج میں خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ طبقہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس کے لئے ان ”دہقانوں“ کے منصب تک بھی پہنچنا بعد از قیاس تھا جنہیں اپنی جاگیروں سے مستفید ہونے کا اختیار حاصل تھا کیوں کہ دونوں کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل تھی۔ عمائدین کے اوپر چار بڑے پادگوسفان یعنی گورنر ہوتے تھے جو غالباً سلطنت کے چار مراکز سے متعلق چار خطوں کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ اقتدار کی اس سیڑھی کے سب سے اوپر شاہی کابینہ ہوتی تھی جس کی تشکیل دیگر عہدہ داروں کے علاوہ Hazarpet یعنی وزیر اعظم، Mobedan-Mobed یعنی بڑے پجاری، Harbad یعنی آتش مقدس کا امین، دبیر پد یعنی ناظم اعلیٰ اور سپاہ پد یعنی سالار اسپ کے ذریعہ ہوتی تھی۔

تمام انتظامیہ کا محور شہنشاہ ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کی ذات سے پندرہ ہزار افسران وابستہ تھے جن کا تقرر زیادہ تر پسرگادائی (Pasargadiae) نام کے حکمران قبیلے سے کیا جاتا تھا۔ شہنشاہ کو عوام کی تجسیم، اقتدار کا مرکز اور تمام تر عظمتوں کا ماخذ تصور کیا جاتا تھا۔ بہت کم موقعوں پر وہ عوام کو اپنے دیدار کراتا تھا اور وہ بھی انتہائی تزک واحتشام اور دھوم دھڑا کے

کے ساتھ۔ ایسے موقعوں پر وہ بہت زیادہ بارعب اور تزک بھڑک والے لباس زیب تن کرتا تھا۔ وہ ایک طلائی تخت پر بیٹھتا تھا اور اس کے سر پر طلائی زنجیر سے بندھا ہوا ایک وزنی تاج لٹکتا رہتا تھا۔ شہزادگان ایک بہت بڑے پردے کے ذریعہ جس پر طرح طرح کی کشیدہ کاری ہوتی تھی اس کو اس وقت تک چھپائے رکھتے تھے جب تک کہ دیدار عام کا مقررہ وقت نہ آجائے۔ شہنشاہ کی ایک داخلی کاؤنسل بھی ہوتی تھی جس میں خود وہ، اس کی بیگم اور ماں، اگر وہ زندہ ہو، شامل ہوتے تھے لیکن اس کی حیثیت محض مشاورتی تھی۔

قدیم معاشروں میں اختیاری قانون سازی کی مثالیں شاذونادر ہی ملتی ہیں۔ ایران بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ جو بھی قانون سازی ہوتی تھی اس کی توثیق طبقۂ موبید جو مزدی (Mazdean) مذہب کا امین تھا، کے ذریعے کی جانی ضروری تھی۔ تعلیم و تدریس کا کام بھی اسی طبقے کے فرائض میں شامل تھا یا یہ اس کا حق تھا اور یہی طبقہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔ ارتداد اور بغاوت کی سزا موت تھی اور اندھا کرنے، سولی دینے، سنگسار کرنے اور بھوکا رکھنے کی سزائیں بھی اکثر و بیشتر دی جاتی تھیں۔ عیسائیت کے ظہور اور فروغ کے بعد عیسائی لوگ، پڑوس کی دشمن بازنطینی ریاست کے ساتھ وابستگی کے سبب ریاست کے غیض و غضب کا سب سے زیادہ شکار ہوتے تھے۔

ظہور اسلام سے قبل ایران میں جو ٹیکس رائج تھے وہ اسلامی روح کے ساتھ خلافت کے اوائل کے دور میں بھی رائج رہے۔ بنیادی ٹیکس زمین کا ٹیکس تھا جسے خراک (عربی میں خراج) کہتے تھے۔ اس ٹیکس کی رقم اس خطے کی مجموعی آبادی کے ہر فرد پر مساوی طور پر عائد ہوتی تھی۔ یہ ٹیکس مجموعی پیداوار کے چھٹے یا تہائی حصے پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسرا اہم ٹیکس جزیت (Gezit) (عربی میں جزیہ) تھا۔ یہ ایک مقررہ سالانہ ٹیکس تھا جو لوگوں پر اس طرح لگایا جاتا تھا کہ اعلیٰ ترین طبقے کو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا اور اس کا بار ان لوگوں پر پڑتا تھا جو زمین جائداد سے محروم تھے یا اس کے اہل نہیں تھے مثلاً یہودی اور عیسائی۔ اس کے علاوہ بقیہ آبادی کے بیس سے پچیس برس کی عمر کے افراد کو بھی یہ بار برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ان دو اہم ٹیکسوں کے علاوہ شہنشاہ کی خدمت میں بڑی بڑی رقوم تحفتاً پیش کرنے کا بھی رواج تھا، خصوصاً سال

کے دو بڑے تہواروں کے موقع پر۔

یہ امر قابل غور ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی پیدائش (۵۷۰ء) کے فوراً قبل کے زمانے میں عرب کی دو پڑوسی سلطنتوں میں ایسے افراد تخت نشین تھے یعنی ایران کا خسرو نوشیرواں اور بازنطین کا جسٹی نی اَن جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں تاریخ کے صفحات پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔

مشرقی رومی سلطنت

محمدؐ کی پیدائش کے وقت ۳۸ برس حکومت کرنے کے بعد جسٹی نی اَن (Justinian) کا انتقال ہوئے ۵ برس گذر چکے تھے۔ اس کے بعد چالیس برس تک قسطنطنیہ کے تخت پر بالترتیب جسٹن دوم (Justin II) (۴)، ٹائبیریس دوم (Tiberues II) (۵)، مارس (Maurice) (۶) اور فوکاس (Phocas) (۷) کا قبضہ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے دوران ہریکلیس (Heraclius) (ہرقل) تخت نشین تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ اپنے آپ کو رومی کہنے والے طبقے ہی کے ہاتھوں ہر وہ چیز ختم کردی گئی جو حقیقی معنی میں رومی تھی۔ اب نظم و نسق پہلے کی طرح “عوام” یا ان کی مجلس نمائندگان (Senate) کے ہاتھوں میں ہونے کے بجائے ایک ایسے نظام پر مشتمل تھا جس کا انحصار شہنشاہ کی مرضی پر تھا۔ عوام خود کئی طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ۱۔ کرول (Curule) طبقہ:۔ زمینوں کا مالک تھا۔ اسے نہ تو فوج میں جانے کا حق تھا نہ تجارت کرنے کا۔ ۲۔ باج گذار طبقہ:۔ ایران کی طرح ان آزاد لوگوں پر مشتمل تھا جو زمینوں کے مالک نہیں تھے اور جنہیں محصول (Capitation Tax) ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس طبقے میں کاری گروں کی ان مختلف انجمنوں کے ارکان بھی آتے تھے جن کی رکنیت وراثت میں حاصل ہوتی تھی۔ ۳۔ فوجی طبقہ: لیکن یہ تمام طبقے زبردست ٹیکسوں کا شکار تھے جو بالآخر سلطنت کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ ایک مصنف کے مطابق “کاشت کاروں کی حیثیت شاہی دربار اور فوج کی شکم پروری اور تن پوشی کے آلہ کار کے سوا اور کچھ نہ تھی”۔ (۹) شہنشاہ کو قانونی ٹیکس لگانے پر ہی صبر نہیں تھا بلکہ وہ اکثر و بیشتر تحفے بھی طلب کرتا تھا جو شروع میں تو اختیاری ہوتے تھے لیکن

دھیرے دھیرے مالیات کا مستقل ذریعہ بن گئے۔

انتظامیہ شہنشاہ کا گھریلو معاملہ بن کر رہ گئی تھی اور مجلس نمائندگان (Senate) اگرچہ جسٹی نی اَن کے دور حکومت میں پوری طرح کچل دیئے جانے سے قبل کچھ عرصہ تک گری پڑی حالت میں چلتی رہی لیکن اس وقت بھی وہ مکمل طور پر ایک لاغر اور بے حیثیت ادارہ بن چکی تھی۔ آخر کار جسٹی نی ان نے اپنی بربریت پسند طبیعت کے عین مطابق قدیم سیاسی نظام کے تمام نقوش مٹا دیئے اور حکومت کی تنظیم اس انداز پر کی کہ ہر چیز کو دربار کی آرائش کا آلہ کار بنانا ممکن ہو سکے۔ یہ بھی ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ جو شخص اتنے زیادہ سیاہ کارناموں کا مرتکب ہوا وہ قدیم رومی قانون کے مدون کی حیثیت سے مشہور ہے اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس قانون ساز کے دور میں عوام جتنے زیادہ بدحال تھے اتنے قدیم یورپ کی تاریخ میں کبھی نہیں رہے۔

آزاد شہریوں کو فروخت کیا جاتا تھا اور ٹیکسوں سے بچنے کے لیے لوگ اپنی انگور کی بیلوں کو خود ہی اکھاڑ دیتے تھے اور اپنے مکانات کو اپنے ہی ہاتھوں سے منہدم کر دیتے تھے۔ (۱۰) ایسے اضلاع میں جہاں کے لوگ دیوالیہ ہو گئے ہوں امیر ترین شہریوں کی املاک اور جائداد کو اس طرح ضبط کرنا عام تھا کہ یہ لوگ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو جائیں۔ جسٹی نی اَن (Justinian) نے اتنے ہی پر بس نہیں کی۔ اس کے دور حکومت میں عہدوں یا مناصب کی کھلے عام فروخت ہوتی تھی، ان احکامات کے ساتھ کہ اس کی رقم شہنشاہ یا اس کی بیگم تھیوڈورا کو ادا کی جائے۔

جہاں تک مخالفین کو برداشت کرنے اور رواداری کا معاملہ ہے، اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ شہنشاہ کے عیسائیت قبول کرنے سے قبل عیسائیوں پر مظالم ہوتے تھے اور اس کے بعد قدیم علوم، یہودی مذہب اور ہر چیز کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی جس پر شہنشاہ کے ذاتی عقیدے کے خلاف ہونے کا ذرا سا بھی شبہ ہوا۔

۲۹ ق م میں جسٹی نی ان نے فن خطابت اور فلسفے کے تمام مدارس بالکل بند کر دیئے اور ان کی امداد کے لئے جو جائدادیں دی گئی تھیں وہ بھی ضبط کر لیں۔ افلاطون کی اکادمی، ارسطو کی

لائی سیم (Liceum) اور زینو کے اسٹوا (Stoa) کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ تھیوڈوسی اس (Theodisius) نے، جس کے نام کے آگے "عظیم" کا لقب لگایا جاتا تھا، پہلے ہی ان اولمپین کھیلوں پر پابندی لگادی تھی جو ایک ہزار برس سے جاری تھے اور جسٹی نی ان کے زمانے میں "فکر و خیال کی راہیں اس قدر مسدود کردی گئی تھیں کہ سوا ان باتوں کے جن کو شہنشاہ کی اجازت حاصل ہو اور کسی بات کی تعلیم نہیں دی جاسکتی تھی" (۱۱) رومی شہنشاہیت میں مذہبی ظلم کی ایک مثال کے طور پر پٹریشین فوکاس کا واقعہ قابل غور ہے جس نے جبراً عیسائیت قبول کرنے سے بچنے کے لئے زہر کھاکر خودکشی کرلی۔ اس کے چند برسوں بعد ایک دوسرے فوکاس نے، جو شہنشاہ تھا، اپنی قلمرو کے تمام یہودیوں کو عیسائی بننے کے احکامات جاری کئے۔ اس کے بعد کا شہنشاہ ہیریکلیس (Heraclius) بھی، جس نے پہلے فوکاس کے ہاتھ اور پاؤں کٹوائے اور بعد میں اسے قتل کروادیا، یہودیوں کا دوست نہیں تھا۔ اس نے انہیں یروشلم سے جلاوطن کردیا اور اس مقدس شہر سے تین ہزار فٹ کی حد کے اندر ان کے داخلے پر پابندی لگادی۔ سلطنت کے اخلاقی زوال کا عالم یہ تھا کہ نئے شہنشاہ کی خود اس کی بھتیجی کے ساتھ شادی کی رسوم خود قسطنطنیہ کے اسقف نے انجام دیں۔

چھٹی صدی کے ربع ثالث کے دوران ایران اور مشرقی روم کے حالات کا خلاصہ اس دور کے ایک عظیم مورخ نے جو خود یونانی روایت کا ایک نمایاں علم بردار تھا یوں بیان کیا ہے، "جسٹی نی ان کی موت اور محمدؐ کی پیدائش کے درمیانی زمانے کے علاوہ شاید تاریخ کا کوئی اور زمانہ ایسا نہیں گذرا جس کے دوران معاشرے کی اخلاقی حالت اتنی پست رہی ہو اور وہ تمام قومیں یا سلطنتیں جن سے یونانی اور رومی واقف تھے توانائی اور خیر سے اتنی بری طرح عاری رہی ہوں۔" (۱۲) بداعمالیوں کو آخر کار کیفر کردار تک پہنچنا ہی تھا اور اس پس منظر میں وہ آگے لکھتا ہے، "بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی پیش بینی انسانی عرفان سے ممکن نہیں، انسانی دانش جن کو انگیز نہیں کرسکتی اور فلسفی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتا کہ وہ اس مشیت الٰہی کے حوالہ سے ان کی توجیہ کرے جو تاریخ عالم میں تمام انسانیت کی عبرت کے لئے ظاہر ہوتی ہے، بالآخر مشرق میں رومی تسلط ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔" (۱۳)

ما قبل اسلام کی عرب ریاستیں

اب ہم خطۂ عرب کی طرف آتے ہیں جسے بعد میں اسلام کا گہوارہ بننا تھا اور پیغمبر اسلام کی پیدائش کے وقت اس کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ عربوں نے اپنے آپ کو تین اہم حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔

۱۔ عرب البائدہ یعنی شمال کی Hamitic آبادیاں

۲۔ عرب العاربہ یعنی قحطان یا یقطان کے سامی النسل عرب جنہوں نے شروع ہی میں عرب البائدہ کو اپنے اندر ضم کر لیا تھا۔

۳۔ عرب المستعربہ جو آل ابراہیم میں سے تھے اور اصلاً شمال کی طرف سے آکر اول الذکر کے ساتھ بس گئے تھے۔

ایک جداگانہ گروہ کی حیثیت سے عرب البائدہ کا وجود بہت پہلے ہی ختم ہو گیا تھا اور جزیرہ نمائے عرب کی آبادی بقیہ دو گروہوں میں ہی منقسم تھی۔ قحطانیوں کا وطن یمن تھا جو جنوب میں واقع تھا جب کہ آل ابراہیم شمال سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ قحطانیوں نے شمال کی جانب ہجرت کی، حجاز اور یمامہ پر قبضہ کیا اور شمال میں اور آگے جا کر شام میں بس گئے جہاں انہوں نے دمشق کے نزدیک عیسائیت کے اوائل کے دنوں میں مملکت غسان قائم کی۔ اس مملکت پر بہت جلد مشرقی رومی سلطنت کا تسلط ہو گیا اور اس کے فرماں روا نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ یہ مملکت خلیفۂ دوم حضرت عمر کے وقت تک قائم رہی۔ (۱۴) قحطانیوں کی دوسری شاخ شمال مشرق کی جانب گئی اور اس نے تقریباً ۱۹۵ میں مملکت حیرہ کی بنا ڈالی۔ غسان کی طرح یہ مملکت بھی بہت دنوں تک خود مختار نہیں رہ سکی اور جلد ہی ایران کے زیر اثر اور زیر تسلط آ گئی۔ تاریخ میں حیرہ کے ایک بادشاہ کا، جس کا نام منذر تھا، ذکر ملتا ہے جس کو شہنشاہ ایران کی جانب سے مہشت یعنی عظیم ترین کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ (۱۵) محمدؐ کی پیدائش کے تقریباً چالیس برس قبل حیرہ کے ابو قابوس نعمان نے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ وہ ناکام رہا اور آخر کار یہ مملکت ۶۱۰ میں خسرو دوم کے ذریعہ ایرانی سلطنت میں ضم کر لی گئی۔ (۱۶)

لہٰذا ظاہر ہے کہ غسان اور حیرہ کی بادشاہتیں اتنی غیر اہم اور مغلوب تھیں کہ ان

کے لئے تاریخ پر اثرانداز ہونا ممکن نہیں تھا۔ وسط مشرقی عرب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہاں کے یمنی بھی ایران کے زیر تسلط آگئے۔ البتہ ایرانی مرکز سے دور ہونے کے سبب انہیں نسبتاً زیادہ خود مختاری حاصل رہی۔ جنوب بعید جو قحطانیوں کا وطن تھا اپنے پڑوسی حبشہ (Abyssinia) کے نجاشی کے خلاف جنگ آزادی میں مصروف تھا جو حبشہ کے عیسائیوں اور یمن کے یہودی بادشاہ یوسف ذونواس کے مابین مذہبی تنازعے کے سبب ۵۲۹ میں شروع ہوئی تھی۔ دونوں فریقوں کے درمیان بازیاں پلٹتی رہیں۔ پہلے حبشہ کے عیسائیوں نے بازنطینی مدد سے یمن کے علاقوں پر قبضہ کر لیا پھر یمن کے سیف ذی حمیری نے ایران کی مدد سے انہیں نکال باہر کیا۔ سیف کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا معدی کرب ایران ہی کی مدد سے اس کا جانشین ہوا اور یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ نئے بادشاہ کو تخت نشینی پر مبارک باد دینے کے لئے تمام عرب سے جو سفیر بھیجے گئے ان میں جمہوریہ مکہ کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کے دادا عبد المطلب بھی تھے۔

عموماً تمام سامی قبائل اور خصوصاً عربوں میں ہمیشہ سے انفرادیت کا ایک شدید احساس موجود رہا ہے اور حالاں کہ وہ اپنے آباء واجداد پر فخر کرتے ہیں لیکن ان کی نظر میں اہمیت خاندان کی نہیں فرد اور قبیلہ کی ہوتی ہے۔ عربوں کا سماجی نظام خون کے رشتوں پر قائم تھا اور ہر قبیلہ کا اپنا خدا ہوتا تھا۔ قبیلے کا ہر فرد ایک دوسرے سے ایک مشترکہ معبود کی پرستش کے ذریعہ منسلک تھا۔ قومی شعور نہیں بلکہ شجرۂ نسب اہم ترین حقیقت تھی۔ ہر قبیلے اور خاندان کا ایک مشترکہ جد اعلیٰ ہوتا تھا اور ان کے تمام مردوں اور عورتوں کو اسی کی نسل تصور کیا جاتا تھا۔ اس معاشرے کو مرد مرکوز کہا جا سکتا ہے کیوں کہ نسب مردوں سے چلتا تھا۔ قبیلے کے سردار کو شیخ کہتے تھے جسے شاید قبیلے کا دانش مند ترین شخص تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شیخ کا منصب اصلاً موروثی ہر گز نہیں تھا بلکہ ایک شیخ کے انتقال کے بعد اپنے آپ اس کے جانشین کا انتخاب ہو جاتا تھا حالاں کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ منصب بھی کچھ کچھ موروثی ہو گیا۔ شیخ کی حیثیت رومی خاندانی سردار (*paterfamilias*) کی سی نہیں تھی اور نہ ہی اس کو رومی *patria protestas* جیسے اختیارات حاصل تھے۔ اس کی حیثیت ایک

ثالث اور قیام امن کرنے والے کی تھی۔ لہٰذا وہ شوریدہ سر افراد پر صرف اخلاقی دباؤ ڈال سکتا تھا۔ (۱۷) وہ بلاشبہ بہت زیادہ با اختیار ہوتا تھا لیکن اس کے پاس کلّی اختیارات نہیں ہوتے تھے اور کسی متعین نظام قانون کی غیر موجودگی میں بہت کچھ افراد کی طبعی کیفیات پر منحصر تھا۔ مختلف قبیلوں کے مابین سیاسی تعلقات فریقین کے اخلاقی شعور سے متعین ہوتے تھے اور چوں کہ عربوں میں ایک زبردست احساسِ وقار پایا جاتا تھا اس لئے بین القبائلی کشاکش کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ قدیم یونان کی طرح عرب میں بھی میلے لگتے تھے جیسے دومۃ الجندل حجر، حضر موت، صنعاء اور عکاظ (مکہ کے نزدیک) وغیرہ میں لیکن کسی قسم کا یک جہتی کا احساس پیدا ہونا تو دور رہا، ان کے سبب مختلف گروہوں کے سیاسی اختلافات کو اور زیادہ پختہ ہونے کا موقع ملتا تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ مذکورہ بالا ایک بھی ریاست آزاد نہیں تھی۔ وہ یا تو ایران کے زیر اقتدار تھیں یا بازنطینی یا حبشہ کی شہنشاہی کے۔ عربوں کی آزادی کا مظاہرہ ان ریاستوں میں نہیں بلکہ مختلف قبیلوں خصوصاً مغربی عرب کے قبیلوں میں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مورخ لکھتا ہے، ''ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشین رکھتے ہوئے اندازہ کرنا چاہیئے (کہ ایسی صورت حال میں) فرد کے ماوراء ایک پائے دار نظام قانون قائم کرنے کے لئے کتنی زبردست جدوجہد درکار تھی''۔ (۱۸)

جمہوریہ مکہ

مکہ جرہموں (Jerhumites) کے یمنی خاندان کا باج گذار علاقہ تھا۔ تیسری صدی تک مکہ اس خاندان کے زیر نگین رہا۔ اس کے بعد مکہ اور جنوبی حجاز پر قحطانی بنی خزاعہ کا اقتدار قائم ہو گیا۔ پھر قصیٰ نے ان لوگوں سے اقتدار چھین لیا۔ وہ ساتویں پیڑھی میں فہر جس کا لقب قریش تھا اور جو مشہور قبیلۂ قریش کا جد اعلیٰ تھا، کی نسل میں سے تھا۔ قصیٰ نے شہر کا انتظام سائنسی طریقہ سے کیا۔ اس نے حکومت کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا۔

۱۔ دارالندوہ: جہاں ندوہ یا مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوتا تھا۔ یہ مجلس برسر اقتدار خاندان کے افراد اور چالیس برس سے زیادہ عمر کے شہریوں کے ذریعے تشکیل پاتی تھی۔

۲۔ لوایا: علم جو حکمراں کی فوجی طاقت کا نشان ہوتا تھا اور جنگ کے دنوں میں سپہ سالار

کو دیا جاتا تھا۔

۳۔ رفادہ: یہ ایک قسم کا ٹیکس تھا جو مکہ سے ۶ کلومیٹر مشرق میں واقع مقام منیٰ میں منعقد ہونے والے سالانہ اجتماع کے غریب زائرین کی امداد کے لئے وصول کیا جاتا تھا۔

۴۔ سقایہ: سقایہ یا کنوؤں کا انتظام جو عربوں کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔

۵۔ حجابہ: حجابہ یا کعبے کی کنجیوں کی امانت داری اور قدیم رسوم عبادت کی نگرانی کا شعبہ۔ ۴۸۰ میں قصیٰ کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں میں حکومت کے ان شعبوں کی تقسیم پر طویل مدت تک تنازعات چلتے رہے اور مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ساتویں صدی کے اوائل میں کعب جو قریش کی چوتھی پیڑھی میں تھا، کے وارثوں نے ان شعبوں کی ملکیت کو آپس میں دوبارہ تقسیم کیا۔ (۱۹) یہ تقسیم اسلامی اداروں کے تمام طالب علموں کے لئے دلچسپی کا موضوع ہے کیوں کہ ان میں سے بعض عہدے داروں کے نام خود اسلام کی تاریخ میں بھی جلی حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔

۱۔ عدی کے سلسلہ کے عمر بن خطاب کے پاس سفارہ یعنی دیگر قبائل یا ریاستوں سے معاملات کے وقت قریش کی نمائندگی کا عہدہ تھا۔

۲۔ حصیص کے سلسلہ کے حارث بن قیس خزینہ یعنی خزانے اور مالیات کے عہدے دار تھے۔

۳۔ خائمہ یعنی مجلس نمائندگان کی سربراہی اور اس کے اجلاس کے انعقاد کا حق اور لوگوں کو جنگ کے لئے بلانے کا عہدہ خالد بن ولید کے پاس تھا۔

۴۔ دیت یعنی مجسٹریٹ کے عہدے پر عبداللہ بن عثمان جو بعد میں ابو بکر کے لقب سے مشہور ہوئے فائز تھے۔

بقیہ تمام عہدوں پر قصیٰ کے وارث اور مُرّہ کا پوتا جس نے بنی خزاعہ سے مکہ کو آزاد کرایا تھا، فائز ہوئے۔

۵۔ قصیٰ کا پوتا اسد بن عبد العزیٰ ندوہ کا صدر اور حکومت کا اعلیٰ ترین عہدے دار تھا۔

۶۔ عثمان بن طلحہ کے پاس حجابہ کا عہدہ تھا لہٰذا وہ کعبہ کی کنجیوں کے امانت دار بھی تھے۔

٧۔ سقایہ یا پانی کے انتظام کا عہدہ عباس بن عبدالمطلب کے پاس تھا۔

٨۔ رفادہ کا انتظام نوفل کے سلسلے کے حارث بن امر کرتے تھے۔

٩۔ سپاہ قریش کی سالاری کا عہدہ یعنی لواء اُمیہ کے پوتے ابوسفیان کے پاس تھا۔

١٠۔ ازلام کا اعزاز ابوسفیان کے بھائی صفوان کو حاصل تھا۔

تسلیم شدہ رواج کے مطابق ان عہدے داروں میں سے سب سے زیادہ معمر شخص کو رئیس کہا جاتا تھا لیکن عبدالمطلب کے انتقال کے بعد ایسی کوئی شخصیت باقی نہیں رہی جس کا عوام میں کچھ رعب اور اثر ہو۔

محمدؐ جنہوں نے انسانی آدرشوں میں انقلاب برپا کردیا، عبداللہ بن عبدالمطلب اور ان کی بیوی آمنہ کے یہاں ٢٩/اگست ٥٧٠ کو پیدا ہوئے۔ اُس دن مکہ پر ابرہہ الاشرم کے ناکام حملے کے پچاس روز گذر چکے تھے۔ (٢٠) آپ کی ولادت کے قبل آپ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور کچھ ہی عرصے بعد ہی آپ اپنے بقیہ دنیوی نگہ داروں سے بھی محروم ہو گئے۔ ٥٧٦ میں آپ کی والدہ کا انتقال ہوا اور ٥٧٩ میں آپ کے دادا چل بسے۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد مکہ کی سیاسی صورت حال تشویش ناک ہو گئی۔ کعب گھرانے کی مختلف شاخوں کے درمیان شدید مقابلہ آرائی کے سبب حکومت کے دسوں عہدے داروں کے مابین مستقل جھگڑے شروع ہو گئے اور ایک طوائف الملوکی کی حالت پیدا ہو گئی جس میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ محمدؐ نے قریش کے سرداروں کو ایک معاہدہ کرنے پر آمادہ کرلیا تاکہ لوگوں کی جان ومال محفوظ رہ سکیں۔ ٥٩٥ میں مکہ کے مقامی اور بیرونی باشندوں کے تحفظ کے لئے مشہور معاہدۂ حِلف الفضول عمل میں آیا۔ (٢١) چند برسوں بعد ہم آپ کو مصریوں (بازنطینیوں) کی سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جنہوں نے ایک عرب، عثمان بن حویرث، کو مکہ پر حملہ کرنے اور اسے فتح کرنے کے لئے رشوت دی تھی۔ ایک اور قابل ذکر واقعہ ہے جس کا حوالہ دینا یہاں ضروری ہے اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ جو اپنے معزز دادا کے انتقال کے بعد مکہ کے معاشرے کو متحد رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے

کتنی زبردست حکمت اور دور رس نگاہ کے حامل تھے۔ یہ مشہور واقعہ کعبے کی تعمیر نو سے متعلق ہے اور اس امر کا بھی شاہد ہے کہ چالیس برس کی عمر، جب آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی، سے قبل ہی آپ کی آواز کتنی زیادہ با اثر اور فیصلہ کن ہو چکی تھی۔

قرآنی ریاست کی ماہیت

اب ہم اس منزل پر آگئے ہیں کہ قرآنی ریاست کی ماہیت اور اصل پر بحث کر سکیں اور دیگر واقعات کے ساتھ کسی موازنے کے بغیر قرآنی ارشادات کی روشنی میں عالمی صورت حال کے ارتقاء کو براہ راست سمجھ سکیں۔ قرآن اصولوں اور ضابطوں کی کتاب ہے جو کہیں کہیں تفصیلی ہیں اور کہیں کہیں غیر واضح اور ادق ہیں۔ قرآن میں بے شمار تاریخی تلمیحیں اور تمثیلیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ یہاں قرآن کے صرف سیاسی پہلوؤں پر بحث کی جائے گی اور جہاں جہاں اصولوں کے ساتھ تاریخی حوالے آگئے ہیں وہاں یہ کوشش ہوگی کہ متن کی تشریح کسی معتبر تاریخی سند کے حوالے سے کی جائے۔

آغاز بحث سے قبل ضروری ہے کہ تمہید کے طور پر پہلی وحی کے نزول سے لے کر رحلت تک، پیغمبر اسلام کی سیاسی زندگی کا ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔

پہلی وحی کے نزول کے وقت آپ کی عمر چالیس برس تھی۔ یہ وحی جس میں آپ کو، جو اُمّی تھے، پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اور جس میں انسان کی بے وقعتی اور علم کا جو انسانی شرف و مجد کا سرچشمہ ہے، ذکر انتہائی حسن کے ساتھ کیا گیا ہے، (۲۲) مکہ سے تقریباً تین کلومیٹر دور واقع غار حرا میں نازل ہوئی تھی۔ اشیاء کا علم اور فطرت کے اصولوں کی تنقیح قرآن کا کلیدی موضوع ہے۔ اس کی تمام تر تعلیمات کا زور اس امر پر ہے کہ ان کے ذریعے انسان پر کائنات کے ابدی قوانین کے تمام اسرار منکشف کئے گئے ہیں اور اسی بنیادی خیال کے پیش نظر قرآن میں پیش کردہ طریقۂ حیات کو 'قدیم' اور 'ناقابل تغیر' کہا گیا ہے۔ (۲۳)

اولین بیعتیں

اسلامی ریاست کے اساسی اصولوں کی نشان دہی ۶۲۰ء اور ۶۲۲ء میں عقبیٰ کی بیعتوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ جان کر تعجب ہوتا ہے کہ دونوں میں سے پہلی بیعت محض چند مٹھی بھر

افراد نے، جن کی تعداد بارہ تھی، کی تھی۔ وہ یثرب کے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے باہر ایک مقام پر ایک ببول کے درخت کے پاس تنہا تشریف فرما تھے۔ اس وقت ان کے دشمن زیادہ تھے، دوست کم۔ ان افراد نے ایک کے بعد ایک آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ "وہ خدا کے ابدی اور اٹل قانون کی پیروی کریں گے، چوری اور زنا سے اجتناب کریں گے، اپنی اولادوں کا قتل نہیں کریں گے، کسی پر بہتان تراشی نہیں کریں گے اور خوشی اور غم دونوں حالتوں میں وفادار رہیں گے۔" (۲۴) اس بیعت میں اس تطہیر نفس، سماجی اصلاحات اور طاقت ور قانونی ضابطہ بندی کے آثار پائے جاتے ہیں جو بہت جلد ہی عمل میں آئی۔ چند برسوں بعد ہونے والی دوسری بیعت میں، جو یثرب ہی کے ۷۲ افراد جن میں چند خواتین بھی شامل تھیں کے ذریعہ عمل میں آئی، رسول اللہؐ کے احکامات کی تعمیل کرنے اور ضرورت پیش آنے پر ان کی حفاظت کرنے کا عہد کیا گیا۔ رسول اللہؐ نے جواباً یہ اعلان کیا کہ ان کے اور بیعت کرنے والوں کے مفادات یکساں ہیں۔ (۲۵) اسی برس اہل مکہ کے ہاتھوں ظلم و ستم کے شکار مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت اپنے عظیم راہبر کے ساتھ یثرب، جسے بعد میں مدینہ کہا گیا، ہجرت کر گئی جہاں اسلام کی اس عظیم اخوت کی بنیاد رکھی گئی جس میں کسی قسم کے نسلی، لسانی یا جغرافیائی تعصبات کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مواخات کے اس اصول کے تحت ہر مہاجر، ہر انصار کا بھائی بن گیا۔ (۲۶)

مدینہ بطور مرکز

مدینے میں مسلمانوں کو وہاں کے مقامی یہودیوں کے ساتھ اپنے طرز عمل اور تعلقات کا تعین کرنا تھا۔ نوزائیدہ اسلامی ریاست کو نہ صرف یہودیوں کے معاملے پر غور کرنا تھا بلکہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان کا بھی تحفظ کرنا تھا۔ محمد صلعم کی دور رس نگاہ اور سیاسی ادراک کی عظمت کا مشاہدہ یہودیوں کے ساتھ کئے گئے آپ کے اس معاہدے میں کیا جا سکتا ہے جس کے تحت یہ اعلان کیا گیا کہ اسلامی ریاست میں یہودیوں کو مسلمانوں کے مساوی شہری حقوق حاصل ہیں۔ مدینے کے شہریوں کے دونوں گروہ مل کر ایک متحدہ قومیت کی تشکیل کریں گے، خطاکار چاہے جس مذہب کا پیرو ہو سزا کا مستحق ہوگا، ضرورت پڑنے پر دونوں گروہوں کو

ریاست کا تحفظ کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا اور مستقبل میں تمام تنازعات کا فیصلہ اللہ کے رسولؐ فرمائیں گے۔ (۲۷)

بلا شبہ وہ لوگ جن کو اس منشور کے تحت تحفظ دیا گیا تھا اگر اپنے وعدے پر قائم رہتے تو ضمیر کی آزادی اور مشترکہ شہریت کا یہ منشور بھی قائم رہتا لیکن یہودی بہت جلد بے چین ہو اٹھے اور انہوں نے نوزائیدہ ریاست کے خلاف عین اس وقت بغاوت کا اعلان کر دیا جب اسے مکہ کے وحشیوں کے حملے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن آپؐ اس سے دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ آپ نے نجران کے عیسائیوں کو بھی آزادی کا ایک منشور پیش کیا جس میں یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ان کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی حاصل ہوگی، کسی بھی پادری یا مذہبی عہدے دار کو اس کے عہدے سے نہیں ہٹایا جائے گا، کوئی شبیہہ یا صلیب تلف نہیں کی جائے گی، ان سے کوئی خراج نہیں لیا جائے گا اور انہیں جنگ کے لئے افراد نہیں دینے پڑیں گے۔ (۲۸)

تاریخ شاہد ہے کہ یہ عظیم معاہدے انہی لوگوں کی مسلح مخالفت کے سبب ختم ہوئے جنہیں ان کے ذریعے تحفظ دیا گیا تھا۔ ایک کے بعد ایک تمام یہودی قبائل کو مدینے سے خارج کیا جانا پڑا۔ اسی طرح آپ کو غسان کے عیسائیوں کے خلاف کارروائی کرنی پڑی کیوں کہ انہوں نے آپؐ کے ایک پرامن سفیر کو شہید کر دیا تھا۔ بہر حال آپؐ نے اپنی رحلت سے قبل تمام عرب کو ایک حکومت اور ایک قانون کے تحت متحد کر دیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا ذکر اس سے قبل اس خطے کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ سیاسی معجزہ اس مختلف النوع خلقِ خدا کے فکر و عمل کے مکمل اتحاد کی شکل میں ظاہر ہوا جو ۷ مارچ ۶۳۲ء کو پیغمبر اسلامؐ کے خطبہ حجۃ الوداع کے وقت موجود تھی۔ (۲۹) یہ خطبہ انسانی تاریخ کے اہم ترین اعلانات میں سے ایک ہے اور اس کے مخاطبین کے لیے یہ امر قابل فخر تھا کہ ان کے عظیم معلمؐ نے تقریباً دو دہائیوں قبل جس مہم کا آغاز کیا تھا وہ مکمل ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تین ماہ بعد ۸ جون ۶۳۲ء کو رحلت فرمائی۔

قرآنی استدلال

پیغمبر اسلامؐ کے چند اہم ترین سیاسی اقدامات جنہوں نے عملاً تمام بنی نوع انسان کی

زندگی کی قلب ماہیت کردی، پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اب ہم اس موضوع کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن میں سیاسی استدلال کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ زیادہ تر تاریخی اور تمثیلی ہے۔ اس کے ذریعے اصولوں کو عرب اور اس کے آس پاس کے دیگر خطوں کی تاریخ کی مثالوں کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جہاں کوئی مجرد تصور پیش کیا گیا ہے وہاں بھی اس کی توضیح عرب قوموں مثلاً عاد و ثمود، مصر، فلسطین، عراق، ایران، مشرقی سلطنت روم وغیرہ کی تاریخ یا روایات کے نتائج کے ذریعے کی گئی ہے۔ قرآن نے قدیم بادشاہتوں اور دیگر قوموں کے درمیان واضح فرق قائم کرتے ہوئے ان کے زوال کے بنیادی اسباب کا ذکر کر کے لوگوں کے لئے سامان عبرت فراہم کیا ہے۔ مثلاً قدیم بادشاہتوں میں مصر کو بجا طور پر قدیم ترین اور سب سے زیادہ طاقت ور بادشاہت بتاتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ طاقت ور ترین بادشاہت نیست و نابود ہو گئی کیوں کہ اس کے فرماں رواؤں نے انسان کی بے حیثیتی کو فراموش کر دیا تھا اور انہوں نے قادر مطلق کے اس ابدی قانون کی خلاف ورزی کی تھی جسے اس نے اپنے منتخب بندوں پر نازل کیا۔ مصر کے فرعون کے پاس موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھیجا گیا کیوں کہ وہ "حد سے گذر گیا تھا" (۳۰) اور "ظالم بن گیا تھا۔" (۳۱) اس کا ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ اس نے ساری قوم کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ (۳۲) وہ ان میں سے کسی کی حمایت کرتا تھا اور کسی پر ظلم۔ اس طرح وہ خلق خدا پر "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول کی بنیاد پر مظالم کرتا تھا جو ایک ایسا اصول ہے جو صرف اسی وقت تک کام کرتا ہے جب تک کہ انسان اپنے اتحاد کی قوت اور اپنے آپ پر کئے گئے ظلم کو محسوس نہیں کرتے۔ بنی اسرائل کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح خدا نے ان لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازا اور نہ صرف یہ کہ ان میں سے ہی ان کے لئے پیغمبروں کا انتخاب کیا بلکہ بادشاہ بھی بنائے (۳۳) مثلاً صالحؑ جن کو خدا نے اس وقت بادشاہ بنایا جب ان کی قوم موسیٰؑ کی وفات کے بعد مظالم کا شکار تھی اور اپنے گھروں سے نکال باہر کر دی گئی تھی۔ (۳۴) یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ اس تذکرے میں اچھے حکمراں اور فرماں روا کی صفات بھی بیان کی گئی ہیں، اور وہ ہیں علم اور قوت۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس میں آج بھی اتنی

ہی صداقت ہے جتنی ہزاروں برس قبل تھی۔

قرآن میں بعض قوموں کی حکومتوں کا ذکر کئے بغیر ان کے زوال کے اسباب کی تعیم کرتے ہوئے یہ اصول پیش کیا گیا ہے کہ "خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔" (۳۵) چوں کہ خدائی قانون عدل پر قائم ہے اس لئے خدائی طریقہ کار کے مطابق پہلے لوگوں کو اعمال حسنہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کے بعد ہی اس کی خلاف ورزی کرنے والی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم کو دے دی جاتی ہے۔ (۳۶) نظام کائنات کے مطابق نوع انسان، جو ریاست کا جوہر ہے، کی طرح قوموں کی زندگی میں بھی عروج و زوال آتا ہے اور جب کسی قوم کا بگاڑ نا قابل اصلاح ہو جاتا ہے تو افراد کی طرح قدرتی قانون کے تحت اس قوم کی بھی موت واقع ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری زیادہ توانا قوم لے لیتی ہے۔ (۳۷)

خدا بطور فرماں روا

قرآن، خدا کی وحدانیت اور زمین پر خدا کی حاکمیت سے متعلق تصورات کی کان ہے۔ (۳۸) تین تصورات قرآن میں پیش کردہ سیاسی اصولوں کی بنیاد ہیں۔

سب سے پہلا تصور ہے توحید، کیوں کہ فرماں روا کے وجود کے لئے فطری طور پر قانون کی وحدت لازمی ہے اور قانون کی وحدت کی بنیاد ان ضابطوں پر ہونی چاہیئے جو قرآن کے واضح بیان کے مطابق نا قابل تغیر ابدی قوانین (۳۹) پر مبنی بلکہ ان کے مماثل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح کسی زمینی بادشاہ کے سامنے اس کی تمام رعایا یکساں مقام و حالت پر ہوتی ہے اسی طرح خدا کی بادشاہت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے روبرو تمام نوع انسان لازمی طور پر یکساں ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ الٰہی قانون کے مقابلے میں انسان حد درجہ بے طاقت ہے۔ قانون سازی کے میدان میں اس کی تمام تگ و دو کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ خدائی قانون کے اسرار و غوامض کی تلاش و جستجو اور دریافت میں مصروف رہے، بالکل اسی طرح جیسے کوئی سائنس داں قوانین فطرت کی دریافت میں یا کوئی ماہر اقتصادیات انسان اور دولت کے درمیان رشتوں کی تلاش میں مصروف رہتا ہے۔ خدائی قانون کی حکمرانی میں یہ امر

بھی مضمر ہے کہ وہ لوگ جو اس کو تسلیم کرتے ہیں یا کم از کم اس کے سائے میں رہنا قبول کرتے ہیں انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچتا لیکن اس کی خلاف ورزی کرنے والے، ریاست کے ذریعے حاصل شدہ تحفظ سے محروم ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے موجودہ زمانے میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو قید و بند یا جرمانے یا موت تک کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ خدا دنیا کا حقیقی فرماں روا ہے۔ اس کا قانون مطلق ہے اور انسان خدا کا نائب ہے۔ (۴۰) خدا انسانوں میں سے بعض کو حکمراں اور منصف مقرر کرتا ہے جن کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ وہ خدائی قانون کے مطابق انصاف کریں اور ذاتی خواہشات کی رو میں بہہ کر گمراہ نہ ہوں۔ (۴۱) یہ تھی قرآن کی تعلیم جس کے جلو میں بے غرض عدل کا وہ مثالی معیار قائم ہوا جو نزول قرآن کے زمانے میں رائج نظام سے ایک قطعی انحراف تھا اور یہی وہ عدل ہے جسے آج ساری دنیا کے انسانوں کا مقدس ترین حق سمجھا جاتا ہے۔

نظم و ضبط کا اصول

قرآن میں بہت کم چیزوں کی اتنی زیادہ مذمت کی گئی ہے جتنی کہ شر پسندی اور بدامنی کی۔ ان دونوں باتوں سے متعلق، جو جماعت کی ہیئت سیاسی کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں، قرآن میں بے شمار آیات آئی ہیں۔ جب خدا نے انسان کو اپنے خلیفہ یا نائب کی حیثیت سے پیدا کیا، تو فرشتوں کو یہ خدشہ ہوا کہ یہ آپس میں خوں ریزی کرے گا اور خلفشار کا موجب ہوگا۔ (۴۲) خدا نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ "آپس میں ایک دوسرے کا خون نہیں بہائیں گے یا کسی کو اس کے گھر سے نہیں نکالیں گے۔" (۴۳) یہ تنبیہ جگہ جگہ دہرائی گئی ہے (۴۴) شاید اس لئے کہ "انسانوں کے مابین پائی جانے والی فطری منافرت" (۴۵) کا ازالہ کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ بدنظمی کو "قتل سے بھی زیادہ برا تصور کیا گیا ہے اور اس کی ترغیب دینے والوں کو عذاب الٰہی" (۴۷) کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ ریاست کو اختیار دیا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو پرامن طریقوں سے اس کی روک تھام کرے لیکن ضرورت پڑنے پر اس کی بیخ کنی کے لئے مسلح جدوجہد سے بھی دریغ نہ کرے۔ (۴۸) سیاسی خلفشار پیدا کرنے والوں کی پیروی نہیں کی جانی چاہیے۔ (۴۹) انہیں یا تو سزائے موت دی جانی چاہیے یا جلاوطن کر دیا جانا

چاہیئے کیوں کہ ان کا یہ عمل "خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ" (۵۰) کے مترادف ہے۔ قرآن میں ذکر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو اپنا اور اپنی آل کا مسکن بنایا تو انہوں نے جو سب سے پہلی دعا مانگی وہ یہ تھی، "(یارب) اس شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امن و خوش حالی کی جنت بنا!"۔ (۵۱) اسلامی سیاسی نظام کی کامیابی کا راز بھی ان لوگوں کے مکمل اتحاد میں پوشیدہ ہے جو اسلام لانے سے قبل ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ (۵۲) مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ متحد رہیں اور ایک دوسرے سے رحم دلی اور اخوت کا سلوک کریں۔ (۵۳) بصورت دیگر ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان دیگر خدا کی نافرمانی کرنے والوں کا ہوا ہے جو ظاہر میں چاہے کچھ بھی کریں لیکن دراصل وہی تمام بدامنی اور خلفشار کی جڑ ہیں۔ (۵۴)

اسلامی جنگ کے اصولوں کو دیگر مقامات کے علاوہ قرآن کی سورۂ روم میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن پوری صراحت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے گی جو ریاست کے خلاف جنگ کریں اور اسلامی تلوار اسی لمحے رک جائے گی جس لمحے وہ اپنے اس عمل سے باز آجائیں اور خدائی قانون دوبارہ غالب آجائے۔ (۵۵)

امن اور فرماں برداری

یہ اصول روح قرآن کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں اس اصول کو 'ایمان' اور 'اسلام' کی دو بلیغ اصطلاحوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ اول الذکر سے مراد ہے امن کی حکمرانی اور ثانی الذکر کا مفہوم ہے فرماں برداری۔ سپردگی یا فرماں برداری کا یہ تصور جدید دور کے خود مختاری کے تصور کے ہم معنی ہے کیوں کہ کسی مرکزی اقتدار کے تئیں سپردگی کے بغیر کوئی بھی ریاست وجود میں نہیں آسکتی۔ مزید برآں چوں کہ قانون الٰہی ہر چیز پر غالب و قادر ہے اور آفاقی ہے لہٰذا تکوینی طور پر انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کے اس قانون کی پیروی کرے جو رسولؐ پر نازل کیا گیا ہے۔ (۵۶) نافرمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کے آباء و اجداد کا رائج کیا ہوا نام نہاد قانون غلط ہے اور چوں کہ ان کے پاس حقیقت کا علم نہیں تھا اس لئے وہ کسی کی رہ نمائی نہیں کرسکتے۔ (۵۷) مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب ان میں آپس میں کوئی اختلاف یا تنازعہ ہو تو وہ پیغمبرؐ کے ذریعے نازل ہونے والے قانون الٰہی سے رجوع کریں تاکہ انہیں وہ سب کچھ

حاصل ہو سکے جو وہ چاہتے ہیں۔ (۵۸) قرآن محض انفعالی سپردگی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو اسلامی ریاست کے شہری، قانون الٰہی کو تمام عالم میں پھیلانے کے لئے خوشی خوشی اپنا سب کچھ خرچ کرنے اور اذیتیں برداشت کرنے کے لئے بھی تیار رہیں۔ (۵۹) یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنی مکّی زندگی کے بارہ برسوں کے دوران محمدؐ نے، اس وقت جب ان پر اور ان کے ساتھیوں پر مظالم ہو رہے تھے، ان پر سنگ باری کی جا رہی تھی اور وہ مختلف سازشوں کا ہدف بنے ہوئے تھے، اسی ضابطے پر خاموشی کے ساتھ عمل کیا تھا۔

قانون اور عدل

قانون الٰہی کی حکومت کے قیام کی راہ میں جو عظیم قربانیاں پیش کرنی پڑتی ہیں وہ اگرچہ انسانوں کے لئے ناپسندیدہ ہیں مگر پھر بھی ان کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ ان سے بالآخر جماعت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ (۶۰) اس حکم سے انسانوں کی ضرورتوں اور ہیئت سیاسی کے تقاضوں اور اجتماعی مفاد کی خاطر جان و مال اور ہر عزیز ترین چیز کو قربان کرنے کے مابین پائے جانے والے تضاد کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کی روشنی میں قرآن کا یہ اعلان ہے کہ قتل کے معاملے میں "انتقام" کا اصول لوگوں کی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے (۶۱) کیوں کہ اس کی اجازت کے بغیر انسانی جان کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں رہ جاتی۔ قرآنی قوانین کا دائرہ قتل اور چوری جیسے جرائم (۶۲) یا "انتقام" کے اس اصول کے قیام تک ہی محدود نہیں ہے جس نے سیماب صفت عربوں کو ایک متحدہ قوم بنا کر، باہم متحارب گروہوں کو پرچم اسلام کے تحت لانے میں ایک زبردست کردار ادا کیا۔ ان کی حد صرف خدائی قانون کے تئیں سپردگی کا جذبہ پیدا کرنے تک بھی نہیں ہے۔ قرآن نے قانون شہادت اور قانونی چارہ جوئی کے جامع ضابطے بھی دیئے ہیں، مثلاً قرض کے معاملات سے متعلق یہ حکم ہے کہ انہیں ضبط تحریر میں لے آیا جائے (۶۳) یا عام فروخت کے معاملے کو تحریر میں لانا ضروری نہیں اور یہ کہ کسی بھی لین دین کے معاملے کی تصدیق کے لئے دو گواہوں کا ہونا کافی ہے۔ (۶۴) ساتویں صدی عیسوی کے زمانے میں عرب جیسے ملک میں جہاں صدیوں سے نظام قانون جیسی کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو ظہور

اسلام کے بعد قانون کے اصولوں نے جس قوت کے ساتھ جڑ پکڑی اور ان اصولوں نے موجودہ زمانے میں قانون کی عام صورت حال پر جو دائمی اثرات چھوڑے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

قرآنی نظام میں عدل کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کے مطابق انسانوں کے مابین عدل ہی رسالت کی اساس ہے اور گذشتہ زمانوں میں بھی انبیاء اور رسولوں کو الٰہی قانون کی حامل کتابوں کے ساتھ بھیجا گیا تھا تاکہ وہ اس کے مطابق انسانوں کے آپسی تنازعات اور جھگڑوں کا فیصلہ کریں۔ (٦۵) پیغمبر اسلام کا بھی ارشاد ہے کہ انہیں عدل قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (٦٦) منصفوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ عدل کریں (٦۷) اور اپنی ذاتی پسند یا ناپسند یا محبت و نفرت کے سبب گمراہ نہ ہوں (٦۸) اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے گواہ درکار ہیں۔ (٦۹) اسی کے ساتھ ہی یہ اصول بھی قائم کیا گیا ہے کہ جو شخص بھی غلط سزائیں دے اسے سخت سزا دی جانی چاہئیے۔ (۷۰) یہ ایسے اصول ہیں جو کسی بھی ریاست کے نظام قانون کی، خواہ اس کی کوئی بھی بنیاد ہو، زینت بن سکتے ہیں اور جو شخص بھی بغیر کسی تعصب کے ان پر غور کرے گا وہ ان کی آفاقیت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

معاشرتی اصلاح

ایک ایسے معاشرے میں، جو قبیلے کے قوانین کے علاوہ کسی اور پابندی کو تسلیم نہیں کرتا تھا، قرآن نے جن معاشرتی اصلاحات کے حصول میں کامیابی حاصل کی اور ایک دوسرے سے برسرپیکار نیز شدید دشمنی رکھنے والوں کے درمیان اتحاد و اخوت کے قیام کا جو بظاہر ناممکن کارنامہ انجام دیا اس کی تفصیل بیان کرنا یہاں بہت مشکل ہے۔ قرآن نے ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے آپ کو قانون الٰہی کے سپرد کردیا ہو ہدایت کی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور کبھی بھی منتشر نہ ہوں۔ (۷۱) قرآن کا کہنا ہے کہ تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں۔ (۷۲) اس کے علاوہ اصلاحات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو قرآن کے سبب وجود میں آیا۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا اگر اس نے صاحب خانہ سے اس کی اجازت نہ لے لی ہو، (۷۳) بچوں کو

خلوت کے وقت اپنے والدین کے کمرے میں داخل ہونے کے لئے ان کی اجازت لینی ضروری ہے، (۷۴) تاجروں کو اپنا سامان معیاری باٹوں اور پیمانوں سے تول کر اور ناپ کر بیچنا چاہئے (۷۵) اور چوری، زنا، بہتان تراشی و دیگر اخلاقی خبائث کی مکمل بیخ کنی وغیرہ۔ (۷۶) قرآن ان اور دیگر بے شمار معاشرتی اصلاحات کے اصولوں سے بھرا پڑا ہے اور یہ اصول محض مثالی تصورات بن کر ہی نہیں رہ گئے بلکہ پُر غرور عربوں کو انہیں اپنی زندگیوں میں ڈھالنے کا اہل بھی بنا دیا گیا۔ انہی اصلاحات کی بدولت عرب کے صحرا نوردوں میں عظیم مدبر، فوجی ماہر، تاجر، بادشاہ اور شہنشاہ پیدا ہوئے اور یہ لوگ ان لوگوں سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے جو صدیوں پرانی تہذیب کا وارث ہونے کی ڈینگ مارتے تھے۔

شوریٰ

قرآنی ریاست میں شوریٰ کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ قرآن میں جہاں بھی اچھے مسلمانوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، جہاں بھی یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا پر بھروسا رکھتے ہیں، برائیوں سے دور رہتے ہیں اور اپنے حقوق کی بہادری کے ساتھ حفاظت کرتے ہیں وہیں ان کی توصیف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کا مشورہ لیتے ہیں۔ (۷۷) پیغمبرؐ کو بھی جہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ کسی معاملے میں اپنا ذہن بنا لینے کے بعد صرف خدا پر بھروسا کریں وہیں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں تک سے بھی مشورہ کریں جو دل میں ان سے دشمنی رکھتے ہیں۔ (۷۸) تعداد کے ساتھ ساتھ صلاحیت کو اہمیت دینے کی یہی جمہوری روح ہے جس نے قرآنی دین کو پوری طرح نہ سہی کم از کم بنیادی اصولوں کی حد تک ساری دنیا کو منقلب کرنے کی طاقت بخشی ہے۔ یہی جمہوری روح قران کے ذریعے مقرر کئے ہوئے ٹیکسوں کے نظام میں بھی ظاہر ہوئی ہے۔ پیغمبرؐ جس طرح کی سادہ زندگی گذارتے تھے اس کے سبب قرآن کے ذریعے قائم حکومت کو چلانے کے لئے بہت زیادہ مالی وسائل کی ضرورت نہیں تھی اور یہ حکومت ہر زمانے کے لئے ایک کارکردگی کی حامل اور بیجا اخراجات سے مبری حکومت کی مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن میں جن ٹیکسوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ زکوٰۃ، (۷۹) جزیہ، (۸۰) خراج (۸۱) اور مال غنیمت (۸۲) ہیں۔ زکوٰۃ کل سرمائے کا

ڈھائی فی صد حصہ ہوتا ہے۔ جزیہ ان لوگوں کو فوجی خدمات سے بری الذمہ قرار دینے کے سبب لیا جاتا تھا جو مسلم ہیئت سیاسی کا حصہ نہیں تھے۔ خراج زمین کا ٹیکس تھا۔ جہاں تک زکوٰۃ اور مال غنیمت کا تعلق ہے قرآن میں اس سلسلے میں مختلف مدیں بیان کی گئیں ہیں جن کے تحت ان کا صَرف کیا جانا ضروری ہے۔ ان دونوں کا بہت تھوڑا سا حصہ ہی حکومت کو ملتا تھا۔ باقی حصہ اس طرح تقسیم ہوتا تھا کہ دولت مندوں کے مال کا کچھ حصہ غریب ترین اور ضرورت مند ترین افراد کی کفالت کے لئے استعمال ہو سکے۔ حکومت کے اخراجات کے لئے پیسہ دوسرے ذرائع سے حاصل ہوتا تھا۔

جنگ کے قوانین

قرآن کی ہمہ گیری ہم پر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم بین الاقوامی معاملات، جنگ کے قوانین، سفارتی امور اور معاہدوں پر غور کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جنگ کے بارے میں جو پہلا اصول نازل ہوا وہ یہ تھا کہ چوں کہ مسلمانوں پر ان کے مخالفین کے ذریعے بہت مظالم ہوئے ہیں (۸۳) اس لئے ان لوگوں سے لڑائی کی اجازت ہونی چاہیئے جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور کیا نیز اس نوزائیدہ جماعت کے خلاف جنگ میں شرکت کی۔ (۸۴) یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی چاہیئے جب تک کہ ”بد نظمی کا خاتمہ نہ ہو جائے“ (۸۵) اور اگر مخالفین امن پر راضی ہوں تو انہیں اس کا موقعہ دیا جانا چاہیئے۔ (۸۶) یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کی یہ پالیسی قطعاً نہیں ہے کہ معاہدہ ان لوگوں سے کیا جائے جو قانون الٰہی کے باغی ہوں (۸۷) اور اگر ایک بار جنگ چھڑ جائے تو پھر ان کے لئے فرار کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی جانی چاہیئے۔ (۸۸) وہ لوگ جو ہر اس چیز کی، جسے وہ مقدس سمجھتے ہیں، حفاظت کریں ان کے لئے بہترین اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ (۸۹) یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن میں ایک جگہ سلسلے وار آیات میں ان غیر مسلموں کو، جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کر لی ہو، ایسے غیر مسلموں سے مختلف قرار دیا گیا ہے، جنہوں نے عہد شکنی کی اور مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے اور یہ بات بھی مکمل صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو کسی بھی قیمت پر ان لوگوں سے عہد شکنی نہیں کرنی چاہیئے جو ان کے ساتھ اپنے عہد

میں پورے اترے۔ (۹۰)

جب ہم جنگی قیدیوں کے تئیں رحم دلی کے سلوک سے متعلق قرآنی حکم پر غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں انسانی معاشرے کو ترقی کا کتنا بلند درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ جنگ بدر (۹۱) کے بعد ہی قیدیوں کو زندہ رکھنے اور یہاں تک کہ انہیں معمولی رقم کی ادائگی کے بعد یا بچوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دینے جیسے کام کرنے کے بدلے رہا کرنے کا نظام شروع کر دیا گیا تھا۔ (۹۲) اس طرح گویا ان عربوں کو، جن کی عورتیں تک میدان جنگ میں مرتے ہوئے یا ہلاک دشمنوں کے لئے ذرہ برابر رحم کا اظہار نہیں کرتی تھیں، (۹۳) اس عظیم دن کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جب پیغمبر اسلام کو ہزاروں مومنین کے ہمراہ ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے وطن مولود میں داخل ہونا تھا، ان سخت احکامات کے ساتھ کہ کوئی بھی شخص، ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر کے انہیں اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے جانے کے لئے مجبور کر دیا تھا کوئی انتقامی کارروائی نہ کرے۔ (۹۴)

رواداری

اب آیئے رواداری کے اس عظیم اصول پر غور کریں جسے قرآن میں انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات دیکھنے کی ہے کہ یہ ساتویں صدی کا زمانہ تھا اور دنیا ابھی مذہبی رواداری جیسے کسی اصول سے قطعاً ناواقف تھی۔ ابھی دنیا کو صلیبی جنگوں کی اذیت سے گزرنا تھا، ابھی جرمنی اور دیگر ملکوں میں مذہبی جنگوں کا غبار اٹھنا تھا، اسپین میں مذہبی سزاؤں، سیکسونی اور یوروپ کے دیگر ملکوں میں جبری تبدیلیٔ مذہب کے واقعات ہونے تھے، انگلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں پر مظالم ہونے تھے اور جرمنی میں یہودیوں پر جبر ہونا تھا۔ ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس زمانے میں ایران اور مصر کی عظیم سلطنتیں کس شد و مد کے ساتھ جبری مذہبی یکسانیت کو نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ لہٰذا قرآن کے ذریعے ایک ریاست میں مختلف مذہبی عقائد کے وجود کو تسلیم کیا جانا اور اس کی بنیاد پر ہمیشہ کے لئے "لا اکراہ فی الدین" (۹۵) کے عظیم الشان اصول کا قیام سیاسی اصولوں کی تاریخ میں ایک بالکل نئی اور تعجب خیز بات تھی۔ جب موسیٰ فرعون کے پاس جانے والے تھے تو انہیں

خدا کی طرف سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرنے کی تلقین کی گئی (۹۶) اور کہا گیا کہ مختلف عقیدے کے شخص کو مخاطب کرنے کے لئے افہام و تفہیم والا طرز تخاطب استعمال کرنا چاہیئے۔ (۹۷) یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جس شخص کی زبان سے اس اصول کا اعلان کرایا گیا وہ خود ہر قسم کے مظالم کا شکار رہ چکا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ اگر انسانوں کا صرف ایک گروہ اس عقیدے کو قبول کرتا ہے جو انہیں اور ان کے پیروؤں کو عزیز ہے تو بھی انہیں انتہائی صبر سے کام لینا چاہیئے یہاں تک کہ باقی لوگوں کے بارے میں خدا کا آخری فیصلہ ہو جائے۔ (۹۸) ہر چند کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں اور منافقوں (۹۹) کے ساتھ دوستانہ روابط رکھنے سے منع کیا گیا ہے تاہم قرآن کے مطابق ایسے غیر مسلموں کا معاملہ، جیسے اس وقت کے عیسائی، واضح طور پر مختلف ہے جو اپنے پیغمبروں کی تعلیمات کے بموجب مسلمانوں کے ساتھ نرم اور انسانی سلوک روا رکھتے ہوں۔ (۱۰۰) جہاں تک اہل مکہ کا تعلق ہے، قرآن میں ایک پوری سورت آئی ہے جس میں ان سے خطاب کرتے ہوئے "تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین" کا اصول قائم کیا گیا ہے۔ (۱۰۱) یہ بات قابل غور ہے کہ مذہبی فکر کا سارا زور مجموعی اعتبار سے رواداری کے اسی اصول پر رہا ہے لیکن اس کے باوجود آج بھی دنیا کے بہت سے حصوں میں مذہبی جبر کے قدیم غیر مہذب جذبات کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اور ایک ہی ملک اور ایک ہی زبان بولنے والے وہ لوگ مظالم کا شکار بنائے جا رہے ہیں جن کے مذہبی عقائد اکثریت کے عقائد سے مختلف ہیں۔ (۱۰۲)

بین الاقوامیت

اب ہم اس آخری اصول پر غور کریں گے جس کے بعد قرآنی ریاست پر ہماری بحث اختتام کو پہنچے گی۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ جس زمانے میں قرآنی تعلیمات نازل ہو رہی تھیں اس وقت نہ صرف عرب بلکہ تمام دینا باہم متحارب قوموں، قبیلوں اور طبقوں کے سبب پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ ایسے عالم میں اسلام نے بین الاقوامیت اور انسانی اقدار کی تعلیم دے کر ایک نئی روایت کی بنا ڈالی۔ یہ ایک زبردست پیش قدمی تھی لیکن یہ پیش قدمی قرآن

کے ذریعے قائم شدہ دیگر اصولوں کے سلسلے ہی کی ایک کڑی تھی۔ ہر چند کہ قرآن کے مطابق انسان مختلف طبقات میں منقسم ہیں اور مختلف منصب اس لئے جائز ہیں کہ ان کے ذریعے ذاتی اہلیتوں کا تعین ہوتا ہے۔ (۱۰۳) تاہم یہ بات بھی پوری صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ قبیلوں اور طبقوں کے مابین دشمنی کا نظام قانون الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے ایک طرح کی سزا کے مترادف ہے (۱۰۴) اور یہ کہ تمام قومیں اور قبیلے اپنی ابتدا اور اصل کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ ان کے الگ الگ وجود کا جواز صرف یہ ہے کہ انسانوں کو آپس میں پہچانا جا سکے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ شرف و مجد کا معیار کسی خاندان، نسل، قبیلے یا قوم سے وابستگی نہیں بلکہ کردار و عمل کی پاکیزگی ہے۔ (۱۰۵) پیغمبر اسلامؐ نے ایک آزاد شدہ غلام سے اپنی چچازاد بہن کی شادی کروا کر، (۱۰۶) ایک آزاد شدہ غلام کو یہ موقع فراہم کر کے کہ وہ قریش کی نسل کو آگے بڑھا سکے، (۱۰۷) طاقت کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی ایک غریب ترین آدمی کی زندگی بسر کر کے اور وہ بھی اس طرح کہ دل میں ہر لمحہ کمزوروں اور مظلوموں کی فلاح کا جذبہ موج زن رہا، قدیم رواجوں کو توڑنے کی زندہ مثال قائم کی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بین الاقوامیت اور آفاقیت کے علم برداروں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نسل، زبان اور ماحول کی بظاہر ناقابل عبور دیواریں رہی ہیں۔ آدرش اور جذبات خواہ کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں انسان آج تک ان دیواروں کو عبور کر کے "انسانوں کی پارلیمنٹ" یا "جمعیت عالم" جیسے کسی ادارے کے قیام میں کامیاب نہیں ہو سکا جس کی آرزو وہ ہمیشہ سے کرتا رہا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے انسانیت کو ایک راہ دکھائی ——— عالم گیر قانون کی راہ ——— جو نسل، زبان، قوم اور جغرافیائی علاقوں کے اختلافات کے باوجود تمام انسانوں کے لئے قابل قبول (۱۰۸) ہے اور سلطنت رومہ، ایران، مصر، عرب اور دنیا کے دیگر علاقوں میں اس قانون کو تسلیم کرنے والوں کے ساتھ وابستگی اختیار کر کے نہ صرف یہ کہ ایک اصولی مثال قائم کی بلکہ اس عالم گیر قانون پر اس طرح عمل کر کے بھی دکھا دیا جیسا آج تک کوئی نہ کر سکا۔

حواشی

۱۔ ۵۳۱۔۵۷۹ء۔ زردشت کا زمانہ ۱۰۰۰ق۔م۔ کا ہے

۲۔ یہ عہدے مغل سلطنت کے آخری دور یا سابقہ ریاست حیدر آباد کے منصب داری نظام سے کسی قدر مماثلت رکھتے ہیں۔

۳۔ ۵۲۸۔۵۶۵

۴۔ ۵۶۵۔۵۷۸

۵۔ ۵۷۸۔۵۸۲

۶۔ ۵۸۲۔۶۰۲

۷۔ ۶۰۲۔۶۲۲

۸۔ ۶۲۲۔۶۳۲

۹۔ جولیئن۔ *Orabb II* صفحہ ۹۲، بحوالہ I. Finley، History of Greece صفحہ ۲۸۱

۱۰۔ Finley ,I ,3:4

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً 4:2

۱۳۔ ایضاً، 4:1

۱۴۔ ۶۳۶ء

۱۵۔ تقریباً ۴۱۸۔۴۶۲ء میں

۱۶۔ خسرو دوم نے ۵۹۰۔۶۲۵ تک حکومت کی۔ غسان اور حیرہ سے متعلق مربوط بیان کے لئے دیکھئے Muir, Life of Mahomet، لندن 1958، I، باب ۳

۱۷۔ J. Wellhausen، Historian's History of the World، VIII, 9

۱۸۔ ایضاً، جلد ۸، صفحہ ۹

۱۹۔ محمدؐ کے وقت میں حکومتی شعبوں کی تقسیم اسی طرح تھی۔

۲۰ ابرہ الاشرخ ایک آزاد شدہ غلام تھا اور مصری نجاشی کی جانب سے یمن کا صوبہ دار بنایا گیا تھا۔ ۵۷۰ء میں رسول اللہ ؐ کی پیدائش سے کچھ پہلے اس نے کعبہ کو منہدم کرنے کے ارادے سے مکہ پر حملہ کیا۔ اس کے پاس ہاتھیوں کی بہت بڑی تعداد تھی اور اس کی فوج اتنی طاقتور تھی کہ اہل مکہ کو اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ ایک روایت کے مطابق مصری فوج پر پرندوں (ابابیلوں) نے کنکریاں برسائیں۔ دوسری روایت کے مطابق حملہ آور چیچک کی وبا پھیلنے کے سبب بھاگ کھڑے ہوئے۔ کریکوف کا خیال ہے کہ ممکن ہے جنہیں پرندوں کا غول کہا گیا ہے وہ بیماری کے کیڑے ہوں۔ یہ واقعہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ دیکھیئے سورہ الفیل

۲۱۔ سیرت ابن ھشام، جلد اول

۲۲۔ قرآن۔ سورہ ۹۶، آیت ا، یہ سورہ ۶۰۹ء میں نازل ہوئی لیکن اس کے نزول کے تین برس بعد تک اسلام کی کھلے عام تبلیغ ممکن نہیں تھی۔

۲۳۔ قرآن، سورہ ۳۰، آیت ۳۰

۲۴۔ ابن ھشام، جلد اول، باب دوم

۲۵۔ ایضاً، جلد اول، باب دوم

۲۶۔ ایضاً، رسول اللہ ؐ ۲ جولائی ۶۲۲ء کو مدینہ پہنچے۔

۲۷۔ ابن ھشام ۔ اس معاہدے کو ضمیر کی آزادی اور بقائے باہم کا انسانی تاریخ کا پہلا منشور تصور کیا جا سکتا ہے۔

۲۸۔ فتوح البلدان از بلاذری۔ کتاب الواقدی بھی دیکھیں۔

۲۹۔ ابن ھشام

۳۰۔ قرآن، سورہ ۲۵، آیت ۴۳

۳۱۔ قرآن، سورہ ۲، آیت ۸۴

۳۲۔ قرآن، سورہ ۲۸، آیت ۴

۳۳۔ قرآن، سورہ ۴۵، آیت ۲۰

۳۴۔ قرآن، سورہ ۲، آیت ۲۴۶۔۲۴۷

۳۵۔ قرآن، سورہ ۱۳، آیت ۱۱

۳۶۔ قرآن، سورہ ۱۰، آیت ۱۴

۳۷۔ قرآن، سورہ ۱۰، آیت ۵۰

۳۸۔ قرآن، سورہ ۳، آیت ۲۶، سورہ ۳، آیت ۱۸۹، سورہ ۱۱، آیت ۴۸، سورہ ۲۳، آیت ۶۵۔۶۷، سورہ ۳۱، آیت ۲۷، سورہ ۶۵، آیت ۲۷، سورہ ۵۷، آیت ۱۰، سورہ ۶۵، آیت ۱۳، سورہ ۵۷، آیت ۵، سورہ ۷۲، آیت ۹

۳۹۔ سورہ ۳۰، آیت ۳۰

۴۰۔ سورہ ۲۷، آیت ۶۲

۴۱۔ جیسے داؤدؑ کو عدل کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ سورہ ۳۸، آیت ۲۷

۴۲۔ سورہ ۲، آیت ۳۰

۴۳۔ سورہ ۲، آیت ۸۴

۴۴۔ سورہ ۹، آیت ۳۶

۴۵۔ سورہ ۲۰، آیت ۱۲۳

۴۶۔ سورہ ۲، آیت ۲۱۷

۴۷۔ سورہ ۴۷، آیت ۲۲۔۲۳

۴۸۔ سورہ ۸، آیت ۳۹

۴۹۔ سورہ ۲۶، آیت ۱۵۱۔۱۵۲

۵۰۔ سورہ ۵، آیت ۳۳

۵۱۔ سورہ ۱۴، آیت ۳۵

۵۲۔ سورہ ۴۸، آیت ۲۴

۵۳۔ سورہ ۴۹، آیت ۹۔۱۰

۵۴۔ سورہ ۲، آیت ۱۱

۵۵۔ سورہ ۲، آیت ۱۹۰۔ ۱۹۳

۵۶۔ سورہ ۳، آیت ۳۲، سورہ ۸، آیت ۲۰، سورہ ۴۸، آیت ۱۵، سورہ ۴، آیت ۸۰

۵۷۔ سورہ ۲، آیت ۱۷۰

۵۸۔ سورہ ۴، آیت ۵۔ ۹

۵۹۔ سورہ ۲، آیت ۱۵۵۔ ۱۵۷، سورہ ۲، آیت ۲۱۶

۶۰۔ سورہ ۲، آیت ۲۱۶

۶۱۔ سورہ ۲، آیت ۱۷۸

۶۲۔ سورہ ۵، آیت ۳۶، سورہ ۲۴، آیت ۲

۶۳۔ سورہ ۲، آیت ۲۸۲

۶۴۔ سورہ ۲، آیت ۱۷۸

۶۵۔ سورہ ۲، آیت ۲۱۳

۶۶۔ سورہ ۴۲، آیت ۱۵

۶۷۔ سورہ ۴، آیت ۵۸

۶۸۔ سورہ ۵، آیت ۸

۶۹۔ سورہ ۲، آیت ۲۸۳

۷۰۔ سورہ ۲۴، آیت ۴

۷۱۔ سورہ ۳، آیت ۱۰۳

۷۲۔ سورہ ۵، آیت ۳

۷۳۔ سورہ ۲۴، آیت ۲۷

۷۴۔ سورہ ۲۴، آیت ۵۹۔ یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ کس طرح غیر مسلم مغربی دنیا میں یہ اور اسی قسم کے دیگر اصول رائج ہوئے۔

۷۵۔ سورہ ۱۱، آیت ۸۵

۷۶۔ سورہ ۹، آیت ۱۲۔ عقبیٰ کی دو بیعتوں میں سے ایک جسے خواتین کی بیعت بھی کہتے ہیں، کا مقصد بھی یہی تھا۔ دوسری بیعت میں دفاعی فرائض کا تذکرہ ہے۔

۷۷۔ سورہ ۴۲، آیت ۳۸

۷۸۔ سورہ ۳، آیت ۱۵۹۔ مسلم (کتاب الفضائل) میں بھی ایک واضح حدیث ہے جس میں ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ عیہ وسلم نے اہل محفل سے فرمایا کہ دنیوی معاملات میں وہ ان سے بہتر معلومات رکھتے ہیں۔

۷۹۔ سورہ ۹، آیت ۶۰

۸۰۔ سورہ ۲۳، آیت ۷۲

۸۱۔ سورہ ۸، آیت ۱

۸۲۔ سورہ ۸، آیت ۴۰

۸۳۔ سورہ ۱۲، آیت ۳۹

۸۴۔ سورہ ۶۰، آیت ۸

۸۵۔ سورہ ۲، آیت ۱۹۳

۸۶۔ سورہ ۸، آیت ۶۱

۸۷۔ سورہ ۴، آیت ۱۳۸۔۱۳۹

۸۸۔ سورہ ۴، آیت ۱۲۳، سورہ ۴۷، آیت ۵

۸۹۔ سورہ ۴، آیت ۷۴

۹۰۔ سورہ ۴، آیت ۱۰۔۱۲

۹۱۔ ۶۲۴ء

۹۲۔ سورہ ۸، آیت ۷۰

۹۳۔ غزوۂ بدر میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے رسول اللہؐ کے چچا حمزہؓ کا سینہ چاک کر کے ان کا خون پیا تھا اور کلیجہ چبا ڈالا تھا۔

۹۴۔ فتح مکہ، جنوری ۶۳۰ء

۹۵۔ سورہ ۲، آیت ۲۵۶، سورہ ۱، آیت ۴۵

۹۶۔ سورہ ۳۰، آیت ۴۴

۹۷۔ سورہ ۱۶، آیت ۱۲۵

۹۸۔ سورہ ۷، آیت ۸۶

۹۹۔ سورہ ۳، آیت ۱۱۸

۱۰۰۔ سورہ ۵، آیت ۸۲

۱۰۱۔ سورہ ۱۰۹

۱۰۲۔ مثلاً ہمارے اپنے عہد میں نازی جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ ہونے والے مظالم۔

۱۰۳۔ سورہ ۶، آیت ۱۶۶، سورہ ۱۷، آیت ۲۱

۱۰۴۔ سورہ ۶، آیت ۶۵

۱۰۵۔ سورہ ۴۹، آیت ۱۳

۱۰۶۔ عبدالمطلب کی پوتی زینب کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک غلام جو بعد میں آزاد کر دیے گئے، زید بن حارث کے ساتھ ہوئی تھی۔

۱۰۷۔ غزوہ موتہ ۶۲۹ء

۱۰۸۔ تفصیل کے لئے دیکھیے رسالہ ترجمان القرآن، حیدر آباد دکن، جلد ۳ (۱۳۵۲)، صفحہ ۳۰۔۳۷

تبصرہ

کتاب : معماران جامعہ
مصنف : پروفیسر ظفر احمد نظامی
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
قیمت : ۲۵۰ روپے
صفحات : ۲۸۸

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک منظم تعلیمی تحریک کے نتیجے میں ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۰ء کو وجود میں آئی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے نتائج ہندستانی مسلمانوں کے لئے خاص طور پر بڑے بھیانک تھے۔ اس زمانے میں سر سید احمد خاں نے گہرے شعور اور بالغ نظری کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کا جہاد شروع کیا۔ انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی، 'تہذیب الاخلاق' کا اجراء کیا اور ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم رہنماؤں نے تعلیمی مسائل پر بہت غور و خوض کیا اور مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے اکابر رہنماؤں کی سرپرستی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علی گڑھ میں بنیاد رکھی گئی۔

جامعہ کی پیدائش، بچپن اور جوانی کی زندگی کا سفر ایک طویل جدوجہد کا دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ہے۔ اس ادارے کے بانیوں اور معماروں نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ اسے جب اپنے وطن میں جینا دشوار ہو گیا تو دہلی کی جانب ہجرت کرنا پڑا۔ دہلی کی آب و ہوا اسے خوب راس آئی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ ادارہ ایک مضبوط سرسبز و شاداب تناور شجر کی صورت اختیار کر گیا:

کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء

زیر نظر کتاب میں پروفیسر ظفر احمد نظامی نے جامعہ سے اپنی محبت و عقیدت کے اظہار کے ساتھ ساتھ جامعہ اور اہل جامعہ کی تاریخ بیان کرنے کے علاوہ اس عہد کی تاریخ پر بھی بین السطور روشنی ڈالی ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایم. اے. او. کالج علی گڑھ کی مسجد میں بعد نماز جمعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رسم افتتاح کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں جو کچھ ارشاد فرمایا تھا اس کی معنویت آج بھی تازہ ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> ”اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیو بند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا........“

جامعہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

> ”مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال، ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کریں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیش تر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔“

پروفیسر نظامی نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مہاتما گاندھی کو جامعہ کے بانیوں میں شمار کیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور شفیق الرحمن قدوائی جامعہ کے

معماروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان کے نزدیک اس فہرست میں اور بھی نام شامل کیے جاسکتے ہیں لیکن زیر نظر کتاب ان افراد کی خدمات ہی کے ذکر پر مشتمل ہے۔

معماران جامعہ کی ترتیب میں عمر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جو عمر میں بڑے تھے ان کا ذکر مقدم ہے۔ معمارانِ جامعہ کا یہ تذکرہ نہایت دلچسپ اور وسیع معلومات پر مبنی ہے۔ فاضل مرتب نے بڑی محنت اور تلاش و تحقیق سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ اس میں بعض نایاب اقتباسات اور قیمتی مشتملات درج ہیں۔ پھر بھی اس کتاب کے مطالعے کے دوران جو چیز کھٹکی وہ حوالوں کا فقدان ہے۔ حوالے شامل ہو جائیں تو اس کی حیثیت ایک قیمتی دستاویز کی ہو جائے گی۔

مکتبہ جامعہ نے اس کتاب کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب برادران جامعہ کے علاوہ تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم اور سماجی کارکنوں کے حلقوں میں بھی بے حد مقبول ہو گی۔

محمد اسحاق

شرکت

جناب سید حامد	چانسلر، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی اور سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی	سربراہ، شعبۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
پروفیسر شکیل الرحمان	سابق وائس چانسلر، للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگا، بہار اور سابق مرکزی وزیر
ڈاکٹر صبیحہ سلطانہ خاں	۷/ر نشاط اپارٹمنٹس، شمشاد مارکٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
محترمہ انجم آراء فلاحی	شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
جناب زلفی وقار	رسرچ اسسٹنٹ، بلکینٹ یونیورسٹی، انقرہ، ترکی
جناب اخلاق احمد آہن	رسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
پروفیسر عبدالعلی	شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر صلاح الدین	شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
جناب محمد اسلم عمری	ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ
پروفیسر ہارون خاں شیروانی (مرحوم)	مشہور مورخ، معلم اور دانش ور
ڈاکٹر محمد اسحاق	شعبۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
پروفیسر اختر الواسع	شعبۂ اسلامیات، اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو اکادمی دہلی

کی چند اہم مطبوعات

اردو کلاسیکل ہندی اور انگریزی ڈکشنری

مرتب: جان۔ ٹی۔ پلیٹس، صفحات: ۱۲۵۹، قیمت: ۲۵۰ روپے

آثار الصنادید (مع مقدمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

تصنیف: سر سید احمد خاں، صفحات: ۷۳۸، قیمت: ۲۰۰ روپے

اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ

مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ، صفحات: ۵۳۳، قیمت: ۸۰ روپے

اِس آباد خرابے میں (خود نوشت سوانح)

اخترالایمان، صفحات: ۲۳۳، قیمت: ۶۰ روپے

دہلوی اردو

مصنف: سید ضمیر حسن دہلوی، صفحات: ۲۷۲، قیمت: ۹۰ روپے

نمائندہ اردو افسانے

مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس، صفحات: ۳۲۶، قیمت: ۷۵ روپے

دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر

مصنف: پروفیسر محمد حسن، صفحات: ۳۹۰، قیمت: ۳۵ روپے

بستیاں (افسانے)

مصنف: جوگندر پال، صفحات: ۲۱۳، قیمت: ۵۰ روپے

عالم میں انتخاب دِلّی

مصنف: مہیشور دیال، صفحات: ۵۱۶، قیمت: ۷۰ روپے

اردو تھیٹر: کل اور آج

مرتبین: مخمور سعیدی، انیس اعظمی، صفحات: ۲۷۶، قیمت: ۷۵ روپے

دیوانِ حالی

مقدمہ: رشید حسن خاں، صفحات: ۲۳۲، قیمت: ۳۰ روپے

چراغ دہلی

مصنف: میرزا حیرت دہلوی، صفحات: ۵۳۶، قیمت: ۵۰ روپے

فوائد الفواد (حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کا مجموعہ)

مرتب و مترجم: خواجہ حسن ثانی نظامی، صفحات: ۱۰۸۸، قیمت: ۱۰۰ روپے

آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل

مرتب: پروفیسر عنوان چشتی، صفحات: ۳۸۴، قیمت: ۶۵ روپے

آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ

مرتب: پروفیسر شمیم حنفی، صفحات: ۲۵۵، قیمت: ۳۰ روپے

داغ دہلوی حیات اور کارنامے

مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، صفحات: ۲۳۸، قیمت: ۵۰ روپے

کلیات مکاتیب اقبال (مکمل سیٹ چار جلدوں میں)

مرتب: سید مظفر حسین برنی، صفحات: ۳۹۰۸، قیمت: سات سو روپے

انتخاب کلام عمیق حنفی

مرتب: شمیم حنفی، صفحات: ۹۶، قیمت: ۲۵ روپے

انتخاب کلام سلام مچھلی شہری

مرتب: عزیز اندوری، صفحات: ۹۶، قیمت: ۲۵ روپے

انتخاب کلام بسمل سعیدی

مرتب: مخمور سعیدی، صفحات: ۹۶، قیمت: ۲۵ روپے

انتخاب کلام شمیم کرہانی

مرتب: پروفیسر حنیف کیفی، صفحات: ۹۶، قیمت: ۲۵ روپے

رابطہ: اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی

علم و ادب کا عظیم مرکز

رامپور رضا لائبریری

- اردو، ہندی، عربی، فارسی، ترکی، پشتو اور سنسکرت کے نادر مخطوطات کا بیش قیمت ذخیرہ
- قدیم اداروں بالخصوص عہد مغلیہ کی تاریخی پینٹنگس اور نایاب تصاویر
- اردو، انگریزی، فارسی، عربی اور ہندی کی ساٹھ ہزار سے زیادہ کم یاب مطبوعات
- قدیم و جدید اردو رسائل کا بہترین ذخیرہ
- جدید سہولتوں کے ساتھ دار المطالعہ کا بہترین نظم اور اسکالرز کے قیام کے لئے گیسٹ روم
- تاریخی اور پرشکوہ عمارت میں تحقیق و مطالعہ کے لئے پرسکون ماحول
- خوبصورت حامد منزل کے دربار ہال میں نوادرات کا میوزیم

اہل علم و ادب اور اسکالرس کا دلی استقبال کرتی ہے

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

او. ایس. ڈی، رام پور رضا لائبریری، رام پور

Vol. XXXII- No.3 R.N. 17614/69 July 2000

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

Zakir Husain Institue of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-110025

سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن

وزارتِ صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند، ڈپارٹمنٹ آف انڈین سسٹمز آف میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی

کیا آپ جانتے ہیں؟

سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، وزارتِ صحت و خاندانی بہبود، (شعبہ ہندستانی طریقہائے علاج و ہومیوپیتھی) حکومت ہند کے تحت ایک خود مختار ادارہ ہے۔ ۱۹۷۸ء میں اپنے قیام کے بعد سے یہ ادارہ یونانی طب کے بنیادی اصولوں اور عملی پہلوؤں کی تحقیق میں مسلسل مصروف رہا ہے، اور اس مدت میں اس کی حیثیت اپنے میدان میں دنیا کے رہنما کی ہوگئی ہے۔

تنظیمی خاکہ : ملک کے مختلف حصوں میں اس کونسل کے ۳۲ تحقیقی ادارے کام کر رہے ہیں۔

میدان عمل : کونسل کے تحقیقی منصوبوں کے چار اہم دائرہ کار ہیں۔

۱۔ معالجاتی تحقیق ۲۔ ادویہ کی معیار بندی ۳۔ علمی تحقیق ۴۔ دوائی پودوں کا سروے اور کاشت

اہم کامیابیاں

معالجاتی تحقیق : برص (لیوکوڈرما)، التہاب تجاویف انف (سائنوسائٹس)، التہاب کبد حاد (وائرل ہیپاٹائٹس)، بحر فارسی (اکزیما)، حمی اجامیہ (ملیریا)، وجع المفاصل (ربیومیٹائڈ آرتھرائٹس) اور ضیق النفس (برانکیل استھما) کے کامیاب علاج کے لیے خالص فطری، معیار بند اور بغیر کسی نقصان دہ اثرات والی ۱۹ دوائیں تیار کرلی گئی ہیں۔ ان دواؤں میں سات (۷) دواؤں کو پیٹنٹ کرانے کی کارروائی شروع کردی گئی ہے۔

ادویہ کی معیار بندی

... ۲۱۲ مفرد اور ۳۸۵ مرکب یونانی ادویہ کے معیارات مقرر کرلیے گئے ہیں۔
... دواؤں کی تیاری کے میدان میں اعلیٰ تحقیق کے لیے کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی. ایس. آئی. آر) کے ساتھ مفاہمتی یادداشت (میمورنڈم آف انڈرسٹینڈنگ) پر دستخط کیے گئے۔

علمی تحقیق

پچیس قدیم یونانی طبی کتب (جن میں سے زیادہ تر مخطوطات ہیں) کے عربی، فارسی سے اردو میں ترجمے کیے گئے ہیں، اور ان کو ترتیب دے کر شائع کیا گیا ہے۔

دوائی پودوں کا سروے اور کاشت

... جنگلات سے ۴۰۰ دواؤں کے ۷۶۵۷۴ نمونے فراہم کیے گئے ہیں۔
... چار اہم اقسام کے دوائی پودوں کی کامیاب کاشت کی گئی۔
... ۶۵۰۰ عوامی دوائی دعووں کو مرتب کیا گیا۔

اشاعت

... ۱۰۰۰ تحقیقی مضامین (ریسرچ پیپر) تیار کیے گئے اور ۹۲ تحقیقی کتابوں کی اشاعت ہوئی، ایک دو ماہی سی. سی. آر. یو. ایم. نیوز لیٹر (انگریزی) مستقل شائع ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سہ ماہی ترجمان "جہان طب" اردو میں اور यूनानी चिकित्सा और स्वास्थ्य ہندی میں اور سالانہ رپورٹ باقاعدگی سے شائع ہوتی ہے۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ قائم کریں:

ڈائرکٹر سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن
وزارت صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند، ڈپارٹمنٹ آف انڈین سسٹمز آف میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی
۶۱-۶۵، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جنک پوری، نئی دہلی-۱۱۰۰۵۸
ٹیلیفون: ۵۶۱۱۹۸۱-۱۱-۹۱ فیکس: ۵۶۱۱۹۶۵-۱۱-۹۱

ای میل CCRUM@del3.VSNL.net.in ویب سائٹ WWW.Unani Medicine.Com. *WWW.Unani